UNIVERSAL LIBRARY
OU_226316
UNIVERSAL LIBRARY

OUP—881—5-8-74—15,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۲۹۷۰۶ ع ۲ Accession No. A 762

Author عمر حیات خاں

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ

براہینِ وحی

مرتبہ
محمد اقبال سلمانی

مکتبہ اُمتِ مسلمہ ہند امرت سر

تفسیر بیانٌ للنّاس

اس تفسیر میں چھ خصوصیتیں ہیں، جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) اس کے مخاطب بلا لحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں، جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

(۲) اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو

(۳) تشریح میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۴) اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے، جو محکمات سے واضح ہے۔

(۵) اس کے ساتھ ہی سُنّت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔

(۶) قوانین و دانش کا احیاء۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا دبیز۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ باوجود ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے قیمتیں نہایت مختصر، یعنی:

منزلِ اوّل صفحات ۸۰۰ (سے)، منزلِ دوم غیر مجلد (عہ)، منزل سوم، (عہ/)، منزل چہارم (عہ/)، منزل پنجم (عہ)، منزل ششم (عاً)، منزل ہفتم (عہ/)

نوٹ: مجلد سنہری تفسیر کے لیے ایک روپیہ چار آنے فی جلد زاید ہو گا۔

مکتبہ اُمّتِ مُسلمہ (ہند) امرتسر

وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ
بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ

براہینِ وحی

مرتّبہ

محمد اقبال سلمانی

مکتبہ اُمّت مسلمہ - امرت سر

دوسرا ایڈیشن

مجلّد تین روپے ۸ /

غیر مجلّد دو روپے ۸ /

کتابِ زندہ

(علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ زیرِ گردوں سرِّ تکوینِ تو چیست؟

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال ست و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرفِ او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

پختہ تر سودائے خام از زورِ او در فتد با سنگ جام از زورِ او

می برد پابند و آزاد آورد صید بنداں را بفریاد آورد

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعٰلمیں!

فہرستِ مضامین

نقطۂ آغاز	محمد اقبال سلمانی	۴
نیازیات		۲۶
کیفیتِ وحی	حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ	۴۳
کیا قرآن رسول کا کلام ہے؟	جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی	۴۵
تردیدِ ارتداد	جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	۸۹
نگارِ رفتۂ روزگار	جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی	۱۰۸
حقیقتِ وحی	جناب ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی (کیمبرج)	۱۳۹
"نگار" کا طرزِ دل نگار	جناب مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری	۱۵۸
قرآن بحیثیت کلام الرحمٰن	جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی	۱۶۲
نیاز فتح پوری کے دس سوالوں کے جوابات	جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے	۱۸۸
سیرِ "نگار" سے	جناب عرشی صاحب	۲۰۳
قرآن کیوں خدا کا کلام ہے؟	جناب سید مقبول احمد صاحب بی اے، ڈپٹی کلکٹر	۲۲۰
خدا اور رسول کا احترام	محمد اقبال سلمانی	۲۲۱

نقطۂ آغاز

انسانی اخلاق کی پیچیدگیوں کا معاملہ بھی کچھ عجیب ہی معاملہ ہے! خود غرضی بے غرضی کے بھیس میں، عداوت محبت کے لباس میں، شیطان فرشتوں کی صورت میں، کائنات کے اسٹیج پر ہر زمانے میں، ہر ملک میں ایسے ایسے محیر العقل اور پُر غریب ڈرامے پیش کر چکا ہے کہ اب دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ سچائی، بے غرضی اور اخلاص کے نام تک سے متنفر نظر آرہا ہے۔ زندگی کے کاروبار سے اعتماد کی روح اور بھروسے کی ترغیب رخصت ہو چکی ہے۔ بدظنی اور منافقت کی آندھیوں نے انسانی ضمیر کی روشنی کو گُل کر دیا ہے اور بنی آدم کی شریانوں سے زندگی اور سچائی کا خون خشک ہو گیا ہے!

دنیا بڑی مظلوم ہے، لیکن ابراہیمؑ کا دین اپنی مظلومیت میں سب سے آگے ہے۔ آزر نے، نمرود نے، کالڈیا کے پجاریوں نے آج سے چار ہزار برس پہلے ابراہیمؑ پر اپنے ظلم و ستم کا آغاز کیا تھا اور اُس وقت سے لے کر آج تک ابراہیمؑ کے روحانی جانشین اس ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے۔ ظلم و عداوت کا یہ ورثہ موسیٰؑ کے سامنے فرعون کی ذات میں، عیسیٰؑ کے سامنے فقیہوں اور فریسیوں کی صورت میں، خاتم النبیینؐ کے سامنے بوجہل و بولہب اور مشرکین مکہ کی شکل میں نمودار ہوا جو اپنی مختلف شخصیتوں سے نکلتا ہوا، کبھی مارگولیوث اور سر ولیم میور کے

لباس میں اور کبھی دیانند اور راج پال کے نام سے آج تک باقی ہے۔ اقبالؒ نے اس واضح حقیقت کو کیا ہی جامع الفاظ میں پیش کیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اب یہ شرارِ بولہبی ہمارے زمانے کے ایک ایسے شخص کے وجود میں داخل ہوا ہے جو اپنے آپ کو قرآن کا خادم، مسلمان اور محمد رسول اللہ کا پیرو کہلانے پر بھی مصر ہے!

کسے یقین تھا کہ دنیا کے تختے پر نزولِ قرآن سے چودہ سو سال بعد ایک شخص ایسا بھی پیدا ہوگا، جو ایک طرف تو یہ کہتا پھرے گا کہ میں مسلمان ہوں اور "کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسلمان نہ سمجھے" (نگار دسمبر ۱۹۶۲ء)

اور دوسری طرف یہ اعلان کرے گا کہ

"کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہامِ ربانی، بلکہ انسان کا کلام جانتا ہوں"[1]!

عہدِ رسالت کے منافقوں کا دستور تو یہ تھا کہ

اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (بقرہ)۔	جب یہ لوگ مومنوں سے ملتے ہیں تو (اُن سے) کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب اپنے شیاطین میں جاتے ہیں، تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور مسلمانوں سے ہم ہنسی کیا کرتے ہیں۔

مگر ہمارے زمانے کے منافق کی فریب کاری اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ

[1] نگار جون ۱۹۶۲ء۔

جس طرح اپنے کفر و الحاد کے اظہار کے لیے شیاطین کی "خلوت" سے بے نیاز ہے، اسی طرح وہ اپنے "اسلام" کے لیے دین کے بنیادی اصول کو تسلیم کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اُف! زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفاق کے فن نے بھی کیا کمال حاصل کر لیا ہے!

"براہین وحی" کی اشاعت کا اعلان ہوا، تو اکثر احباب نے ہم پر یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اس طرح نیاز فتحپوری اور اس کے معتقدات کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہو جائے گی، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسے احباب کی رائے نیک نیتی کے باوجود درست نہیں۔ کسی ایسے شخص کو جو اسلام کے پردے میں خود اسلام کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہا ہو، کسی بھی نقطۂ خیال سے ڈھیل نہیں دینی چاہیے، پھر خصوصیت کے ساتھ نیاز جیسی قماش کے لوگوں کو، جن کی تحریریں مسلمانوں کے اچھے تعلیم یافتہ طبقے میں شائع ہوتی ہوں، کبھی معاف نہیں کرنا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ نسل انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نظر عنایت سے پہلے ہی مذہب سے بہت کچھ برگشتہ ہو چکی ہے، اگر ملک کے روشن خیال علماء اور راسخ العقیدہ جرائد ایسے الحاد کے علم برداروں اور اسلام کے دشمنوں کو کھلی چھٹی دے دیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج اگر ایک شخص قرآن حکیم کے خلاف درپے آزار ہے، تو کل دوسرے بے شمار "نیاز مند" اسلام کے خلاف برسرِ آزار ہو جائیں گے۔ ایسے نازک زمانے میں، جب کہ ہندوستان کے ۵ کروڑ مسلمان کسی محکم اسلامی نظام کے اثر و رسوخ سے آزاد ہیں کسی ایک شخص کو ایسی خطرناک جرأت کے ارتکاب کی اجازت دینا، جس سے قرآن حکیم کی عزت پر مزید حملوں کا اندیشہ کیا جا سکے، حد درجہ نادانی اور بے غیرتی کے

مرادف ہے۔ قرآن، مسلمانوں کا دل ہے، ان کا جگر اور جان ہے، ان کی عزت اور آبرو ہے، مسلمان کو سب کچھ برداشت کر لینا چاہیے، یہاں تک کہ اگر کوئی غیر مسلم قرآن کو ایک انسانی کتاب قرار دیتا ہے، تو بھی بُرا نہ ماننا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص مسلمان کہلاتے ہوئے بھی قرآن کی الہامیت سے انکار کرتا ہے، تو اس کے لیے دو ہی راستے کھلے ہیں: اپنے اس عقیدۂ کفر سے باز آجائے یا ترکِ اسلام کا اعلان کر دے، ورنہ اسلام میں ایسے شخص کے لیے کوئی گنجائش نہیں، جو مسلمان کہلا کر مسلمانوں کی سوسائٹی میں "اعتقادی انارکی" کے فروغ و اشاعت کا مجرم ہو!

رہ گئی یہ بات کہ قرآن مجید کی مدافعت سے نیاز کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہو جائے گی، اس اندیشے میں بھی کوئی وقعت نہیں۔ اس سے پہلے بھی اسلام پر حملے کرنے والے لوگوں نے مسلمانوں کو بارہا مشتعل کیا ہے، آخر اُن لوگوں کو کیا اہمیت حاصل ہو گئی ہے؟ سچائی کے مقابلے میں جو بھی شخص کھڑا ہو گا، وہ اپنی رُوسیاہی کی شہرت حاصل کرے تو کرے، ورنہ ایسے لوگوں کی قسمت میں کھلی ناکامی، مقدر ہو چکی ہے! نیاز کو اگر کسی طور سے اس معرکۂ حق و باطل میں کچھ اہمیت حاصل ہو بھی گئی، تو وہ زیادہ سے زیادہ دھرم کے کشو اور راج پال ایسے لوگوں کی صفِ اوّل میں جا کھڑا ہو گا، اس سے آگے اس کے لیے کوئی مقام نہیں ہے!

اور سچی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی الہامیت یا اس کے وحیِ ملفوظ ہونے سے مدیرِ "نگار" نے انکار کر کے ہر لحاظ سے خسارہ ہی اٹھایا ہے۔ ملک کے اونچے علمی حلقوں میں تو پہلے ہی اُن کی "علامگی" اور "قابلیت" پر کوئی اعتماد قائم نہ تھا، مگر اب اوسط درجے کی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں بھی اُن کے "علم و فضیلت" کا بھرم کھل گیا ہے۔ انکارِ الہامیتِ قرآن سے متعلق اُن کی جتنی تحریریں شائع ہوئی ہیں، ان کے سرسری مطالعہ

بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ دراصل "جہل مرکب" کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہیں۔ قرآن حکیم کے خلاف انہوں نے جتنے اعتراض کیے ہیں، سب کے سب سطحی، سنجیدگی سے یک سر عاری اور غیر دانش مندانہ اور قدیم دشمنانِ اسلام کے خیالات سے ماخوذ ہیں۔ قدرت کو غالباً یہی منظور تھا کہ غیروں کے مستعار خیالات کو بھی مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کے علمی غرور کا سر نیچا ہو۔

ان کی قرآن فہمی کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: رسولؐ نے جو کچھ کہا ہے، وہ "ہوائی باتیں" نہیں، یعنی عربی کے ھوٰی کو اُردو کی "ہوا" قرار دے کر اپنی "علامگی" کا راز فاش کیا ہے! اسی طرح کی اور بھی کئی دل چسپ غلطیاں جا بجا اُن سے سرزد ہوئی ہیں، خصوصیت کے ساتھ "بسم اللہ، وحی اور اساطیر الاولین" وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات واعتراضات پڑھنے اور سر دُھننے کے لائق ہیں۔ اسی فضل وکمال کے برتے پر وہ یہ دعوٰی بھی کرتے ہیں:

"جس طرح عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام سمجھنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح مجھے بھی ہے"[1]

لیکن اگر اسلام کا سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا مدیر "نگار" نے سمجھا ہے، تو ہمیں اندیشہ ہے کہ بیگانے تو بیگانے خود اپنے بھی اسلام سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے:

کارما ابتر ز کارِ دیں شدہ است
ہر لئیمے رازدارِ دیں شدہ است

---

[1] "نگار" اگست۔ صفحہ ۳۰

اب ہمیں زیر نظر شمارے کے مضامین پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالنی ہے۔
رسالہ مرتب کرتے وقت ہمارے سامنے ایک بڑی بات یہ تھی کہ جہاں ہم قرآن حکیم کی مدافعت میں اچھے سے اچھے مضمون جمع کریں، وہاں مدیر "نگار" کے ساتھ بھی کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اسی لیے جوابات سے پہلے مدیر "نگار" کے خیالات واعتراضات "نیازیات" کے عنوان سے نقل کر دیے گئے ہیں، تاکہ ہر شخص فریقین کے دلائل کو خود اُن کے اصلی الفاظ میں تسلی کے ساتھ دیکھ سکے اور بحث ونظر کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ کر کسی فیصلے پر پہونچ سکے۔

جوابات کا مطالعہ کرتے وقت آپ دیکھیں گے کہ انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: بعض جوابات نیاز کے سارے مضامین کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں، جو صرف ان کے اُن "دس شبہات" کے جواب میں لکھے گئے ہیں، جو اگست ۱۹۴۰ء کے "نگار" میں "علماء کرام جواب دیں" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اول الذکر تقسیم کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر تاثیر اور مولانا محمد ادریس ندوی کے مقالات خصوصیت کے ساتھ نہایت جامع اور مفصل ہیں۔ مولٰنا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری اور سید مقبول احمد بی اے کے مضامین نیاز کے خیالات کی عمومی تردید پر مشتمل ہیں اور ان میں تفصیلات کو چھوڑ کر صرف جزوی طور پر اثبات الہامیت قرآن کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا مضمون دینی اور دوسرا تاریخی دلائل پر مبنی ہے۔

دوسری ذیل میں مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ایم اے، (فاضل دیوبند) اور حکیم محمد حسین صاحب عرشی کے مضامین شامل ہیں۔ پہلے دونوں مقالے کلامی مباحث لیے ہوئے ہیں اور آخری مضمون کلامی اور قرآنی دونوں طرح کے دلائل پر حاوی ہے!

"حقیقتِ وحی" سے متعلق، لیکن نیاز سے غیر متعلق، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی چند سطور بھی تیمناً رسالے میں شامل کر لی گئی ہیں، ترتیب میں بھی سب سے اوّل ان ہی سطور کو جگہ دی گئی ہے۔ علامہ مرحوم نے وحی سے متعلق یہ عام فہم فلسفہ پیش کیا ہے کہ پیغمبر کو (جیسا کہ نیاز کا دعویٰ ہے) محض خیال یا احساس کی صورت میں وحی نہیں ہو سکتی، بلکہ خیال و احساس لفظوں کے بغیر ایک بے معنی چیز ہے۔ دونوں چیزیں یعنی خیال اور الفاظ، لازم و ملزوم ہیں۔ اس فلسفے کی تحقیق کے لیے کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر سوچ سکتا ہے کہ جب بھی ہمارے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے، تو الفاظ بھی اس کے ساتھ ہی موجود ہوتے ہیں۔ اب مدیر نگار کے فلسفے کو لیجیے۔ وحی کے معنی "اشارہ سریع" یا الہام بالسرعۃ (یا اردو میں "برمحل سوجھ بوجھ") بتانے کے بعد آپ لکھتے ہیں:

"واوحینا الی اُمِّ موسیٰ ان ارضعیہ، ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں"

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیّہ نہ تھیں، اور اس لیے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے، جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں!"

ہم دریافت کرتے ہیں کہ اُمِّ موسیٰ کے جی میں جو بات ڈالی گئی تھی، وہ لفظوں کے بغیر کیونکر ڈالی جا سکتی تھی؟ اگر مدیر نگار کا دماغ عقل و فکر سے بالکل عاری نہیں تو ان کو یہ معمولی بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ خدا تعالیٰ اپنے الہامات کو لفظوں ہی کی صورت میں انسان کے دل پر نازل کرتا ہے!

علامہ اقبالؒ کے مضمون کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون آتا ہے۔ یہ

عالمانہ مضمون ۴۴ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اور جس شرح و بسط، جن جامع و مانع دلائل اور جس مؤثر اور دل نشین انداز کا حامل ہے، اس کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ نیاز نے اپنے چند معاصرین میں جس جس انداز سے چٹکیاں بدلے ہیں وہ سب ایک ایک کر کے موصوف نے اپنے سامنے رکھے ہیں۔ مضمون کی ابتداء میں مدیر "نگار" کی علمی قابلیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ عام حالات میں اسے ذاتیات پر محمول کیا جا سکتا تھا، مگر یہاں معاملے کی نوعیت دوسری ہے۔ یہاں تو یہ دکھلانا مقصود ہے کہ جو شخص قرآن حکیم جیسی عزیز و شریف کتاب کے منہ آ رہا ہے، وہ اور کسی لحاظ سے نہ سہی، کم از کم علمی مرتبے کے رُو سے اس امر کا اہل بھی ہے یا نہیں؟

موصوف نے قرآن حکیم کی متعدد آیات سے یہ واضح کیا ہے کہ کتاب مجید کے تمام قصے یہود سے سُنے سنائے قصے نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کے بیان کئے ہوئے صحیح اور سچے واقعات ہیں۔ اسی سلسلے میں نیاز کی عبرت و بصیرت کے لئے انہوں نے فرانسیسی کے مشہور عالم کانٹے ہنری دی کاسٹری کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

"یہ محال ہے کہ (توحید کا) یہ اعتقاد تورات اور انجیل کے مطالعہ سے پیدا ہوا اگر محمدؐ نے ان کتابوں کو پڑھا ہوتا تو ان کو اُٹھا کر پھینک دیا ہوتا، کیوں کہ وہ اُن کی فطرت اور وجدان اور مذاق کے مخالف تھیں۔ اس قسم کے اعتقاد کا محمدؐ کی زبان سے ادا ہونا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رسول صادق اور پیغمبر مامون تھے"!

اس لغو خیال کی تردید میں کہ "وحی بر محل سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا نام ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"بر محل سوجھ بوجھ سے مقصود وہ علم ہے، جو انسان کو غور و فکر و استدلال

اور ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور وہ کسب و نظر اور حواس کا فیض ہے اور صحت و خطا دونوں کا مورد ہے اور وحی اس علم کا نام ہے، جو بندہ کو بندہ کے غور و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کے بغیر عطا ہوتا ہے اور وہ سراپا یقین اور یک سر صحیح ہوتا ہے جس میں خطا کا امکان ہی نہیں اور اس کو ہر خطا سے محفوظ رکھا جاتا ہے"۔

آگے چل کر اس دعویٰ کے ثبوت میں مولانا نے متعدد آیات نقل کی ہیں۔۔۔ کیا نیاز صاحب اپنا جواب لکھتے وقت اس طرف بھی کچھ توجہ دیں گے؟

"برمحل سوجھ بوجھ" کے مدعی کو مولانا ہی کی پیش کی ہوئی اس آیت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَا اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا۔	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، جن کو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں، تو نہ تو خود اُن کو اس سے پہلے جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

(ہود - ۴)

کیا "برمحل سوجھ بوجھ" سے پرانی تاریخی روایات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں؟

نیاز صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سچ پوچھیے، تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو"[1]

پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"میں کہتا ہوں، رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے

---

[1] "نگار" جون ۱۹۴۰ء۔

ماتحت رسول کے ذہن ودماغ کا نتیجہ سمجھا جائے۔

مولانا فرماتے ہیں:

"اشارۂ خداوندی جب مسلّم ہے اور یہ کوئی موثر چیز بھی ہے، تو پھر رسول کے ذہن ودماغ کا کارنامہ کہاں رہا؟"

یہ دو ایک مثالیں ہیں، ورنہ موصوف نے نیاز فتح پوری کے غیر محکم اور متلوّن ومتضاد خیالات کی جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ قلعی کھولی ہے، اس کا صحیح اندازہ ان کا مقالہ ہی پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔

موصوف کے مضمون کا آخری حصہ یعنی "وحی کے اقسام" پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جانے کا مستحق ہے۔ آپ نے وحی کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) نوعی یا فطری (۲) شخصی یا جزئی اور (۳) وحی نبوی ——— مدیرِ "نگار" کی قابلیت دیکھیے کہ انھوں نے کہیں سے یہ سُن رکھا ہوگا کہ شہد کی مکھی کو بھی وحی نازل ہوئی تھی۔ اس کے معنیٰ بلاشبہ مکھی کی فطری استعداد وقابلیت ہی کے ہیں، لیکن طُرفہ یہ ہے کہ وہ اب ہر جگہ وحی کے یہی ایک معنی چسپاں کیے جا رہے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ بے محل نہ ہوگا: ایک اناڑی طبیب نے کہیں دیکھا کہ ایک اونٹ کے حلق میں تربوز کا ٹکڑا اٹک گیا ہے۔ اونٹ کے مالک نے اُس کی گردن پر ایک چادر کو تہ بہ تہ کرکے رکھا اور اوپر سے پتھر کی دو ایک ضربیں پہنچائیں۔ تربوز ٹوٹ کر حلق سے نیچے اُتر گیا اور اونٹ کی تکلیف دُور ہوگئی۔ اتفاق سے طبیب صاحب کسی گاؤں میں تشریف لے گئے وہاں ایک مریض کے حلق پر سوجن چڑھی ہوئی تھی۔ آپ کے نکتہ رس دماغ کو فوراً یہ سُوجھا کہ ہو نہ ہو، مریض کے گلے میں ضرور

لہ "نگار" جولائی سنہ ۶۳ء۔

کوئی چیز پھنس کر رہ گئی ہے، چنانچہ وہی اونٹ والا علاج یہاں بھی آزمانا مناسب سمجھا۔ مریض کے حلق پر پتھر کی ضرب پڑی ہی تھی کہ اُس نے دم توڑ دیا۔ یہی ——— بالکل یہی حالت نیاز صاحب کی ہے۔ اب جس محل پر بھی وحی کا استعمال ہوتا ہے، وہ جھٹ پکار اُٹھتے ہیں، اس کے معنیٰ نفسانی تاثرات اور "برمحل سوجھ بوجھ" کے ہیں! چلیے، ہم یہی مطلب مانے لیتے ہیں، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کی اس دلیل کا کیا جواب دیا جائے؟

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا (زلزال)۔	زمین اُس دن اپنا سب احوال بتلائے گی، کیوں کہ اُس کے پروردگار نے اُسے وحی کی۔

بے وقوف بھی جانتا ہے کہ یہ شہادت زمین کی برمحل سوجھ بوجھ، نفسانی تاثرات، غور و فکر اور نظر و استدلال کا نتیجہ نہ ہوگی!"

اب مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقالہ "تردید ارتداد" لیجیے۔ آپ نے "صدق" کی مختلف اشاعتوں میں نیاز کے مختلف اعتراضات کے جواب میں جو نوٹ لکھے تھے، ادارۂ "البیان" نے اپنی طرف سے عنوان دے کر ان سب کو یک جا کر دیا ہے۔ اب ہم اس سے ایک مستقل مضمون کا لطف حاصل کر سکتے ہیں!

اس میں کچھ شک نہیں، مولانا ایک مخصوص طنزیہ اسلوبِ تحریر کے مالک ہیں اور وہ اپنی اس روش میں بعض اوقات کیا، اکثر اوقات حدِ اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں، لیکن معلومات و معارف کی فراوانی اور استدلال کے وزن و معقولیت کے اعتبار سے ہم اس خامی تحریر کو بہرحال نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں ——— موصوف، عالم سے زیادہ "فلاسفر" مانے جاتے ہیں اور فی الحقیقت آپ کی

تحریروں میں "فلسفیانہ انداز" بالعموم نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ "نیازیات" کے وہ سب سے پہلے اور سب سے بڑے ماہر ہیں۔ مدیر "نگار" کے رگ وریشہ کو جس خوبی کے ساتھ وہ جانتے اور بیان کرتے ہیں، لاریب یہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔

اس مختصر تعارف میں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن کے مقالے پر پوری پوری روشنی ڈالی جاسکے، لیکن پھر بھی دو ایک مقامات کی طرف توجہ دلانا دلچسپی کا باعث ہوگا ——— مدیر "نگار" کے اس باطل ادعا کے جواب میں کہ

"کلام کا مفہوم اُس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا، جب تک نطق اس سے متعلق نہ ہو اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا، اس لیے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق بھی لازم ہوگا جس کا تعلق یک سر مادیات سے ہے۔"

مولانا لکھتے ہیں:

"لیکن اس منطق کو یہیں تک کیوں محدود رکھیے؟ کیوں نہ کہیے کہ بصارت چوں کہ نام ہے آنکھ کے مخصوص عضلات کی حرکت کا اور سماعت چوں کہ نام ہے کان کے پردوں اور عضلات کے تاثر کا، اس لیے خدا کو بصیر کہہ سکتے ہیں نہ سمیع اور چوں کہ ارادہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کے نظام عصبی کی فعلیت کا، اس لیے خدا کو صاحب ارادہ کہنا اس کا صاحب اعصاب، صاحب دماغ وغیرہ ہونا تسلیم کرنا ہے اور پھر چوں کہ زندگی نام ہے سانس کی آمد و شد کا اور قلب کی حرکت کا، اس لیے خدا کو زندہ کہنا اس کے لیے شرائین خون اور آلاتِ تنفس وغیرہ کا تسلیم کرنا ہے اور جتنی بھی صفات جمالیہ و کمالیہ آج تک اللہ تعالےٰ کے متعلق تسلیم کی گئی ہیں، سب سے ایک ایک کرکے انکار اسی طرح کیا جاسکتا ہے اور

پھر تمام اعراض و صفات سے معرّیٰ محض ہو کر نفس وجود ہی کب ثابت رہ سکتا ہے ؟ ــــ صاحب "نگار" کا یہ احسان کچھ کم ہے کہ انکار ابھی تک صرف صفتِ کلام سے کیا گیا ہے ؟"

اسی طرح مولانا کے تمام نوٹ ایک ایک کر کے دیکھتے چلے جائیے، اگر ایک طرف قرآن مجید کی عظمت و عصمت پر بہتر سے بہتر دلائل موجود ہیں، تو دوسری طرف معترض کی علمی قابلیت بھی بھرپور روشنی میں نظر آرہی ہے۔ نیاز نے اپنے ایک مضمون میں یہودیوں کی کسی کتاب کا نام اُردو اور انگریزی حروف میں پانچ مرتبہ "مرداش ربا" لکھا ہے اور اپنے پڑھنے والوں پر اپنے "وسیع مطالعہ" کا اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا موصوف نے یہ بتا کر کہ کتاب کا نام مرداش نہیں، بلکہ مدراش ہے، نیاز کی "علامگی" کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا ہے ــــ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں نیاز صاحب سے بڑی ہمدردی ہے۔ کاش وہ اپنے علم و فضل پر پردہ ہی پڑا رہنے دیتے، آخر انہیں سرِ محفل رسوا ہونے میں کیا مصلحت نظر آئی تھی ؟

مولانا کے مضمون میں "اساطیر الاوّلین" کی بحث خصوصیت کے ساتھ مستقل ہیثیت رکھتی ہے۔ نیاز نے قرآن مجید کی روایات کے متعلق لکھا ہے کہ "قرآن نے ان کو اساطیر الاوّلین" یا اصنامی روایتوں سے تعبیر کیا ہے" مولانا موصوف نے قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن اپنی روایات کو یہ نام نہیں دیتا، بلکہ قرآن کے دشمنوں نے انہیں "اساطیر الاوّلین" کہا ہے۔ کلام اللہ سے تو اُن کے دعویٰ کی تردید ثابت ہوتی ہے !

"نگار فتنہ روزگار" مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کا بیش قیمت مقالہ ہے۔

آپ نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ نیاز کے ملحدانہ خیالات کی تردید فرمائی ہے۔ آپکے مضمون کا وہ حصّہ جس میں آپ نے قرآن اور بائبل کے قصّوں کا مقابلہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ قصصِ قرآن، بائبل سے ماخوذ نہیں۔ غائت طور پر دلچسپ اور مؤثر ہے۔ آپ نے بتایا ہے: بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰ اپنی ماں کی عزّت نہیں کیا کرتے تھے حضرت سلیمانؑ غیر عورتوں سے مانوس تھے، حضرت داؤدؑ ایک فوجی کی خوب صورت بیوی پر عاشق ہوگئے تھے، حضرت نوحؑ شراب خواری کے عادی تھے، حضرت لوطؑ نے اپنی دو بیٹیوں سے ناجائز تعلقات پیدا کیے، مگر قرآن حکیم میں یہ واقعات مطلقاً موجود نہیں ہیں، بلکہ وہ ان سب پیغمبروں کے بلند اور پاکیزہ اخلاق پر گواہی دیتا ہے۔ پھر بتایا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے کئی واقعات ہیں، جن کا بائبل مطلقاً ذکر نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر تسلیم کیا جائے کہ قرآن مجید کی روایات بائبل سے ماخوذ ہیں؟

زیرِ نظر مضمون کا وہ حصّہ بھی قابلِ لحاظ ہے، جس میں آپ نے قرآن حکیم کی آیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کے قصّے محض قصّے ہی نہیں اور وہ محض "عبرت و بصیرت" ہی کے لیے بیان نہیں کیے گئے، بلکہ وہ صحیح صحیح تاریخی واقعات ہیں جن کے آثار باقیہ اب تک زمین پر قائم ہیں۔ عرب، جن سے براہ راست قرآن مجید مخاطب ہوتا ہے، اُنھیں کھلے الفاظ میں کہا جاتا ہے:

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الصّٰفّٰت)	اور تم پچھلی قوموں کے بچے کھچے آثار پر صبح و شام گزرتے ہو پھر کیا تم نہیں سمجھتے؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر قرآنی روایات کے پیچھے فی الحقیقت کوئی تاریخی بنیاد نظر نہیں تھا، تو رسول اللہؐ اہل عرب کو ان کے عینی مشاہدے کی دعوت کیوں کر

دے سکتے تھے؟

ڈاکٹر تاثیر کے مقالے کا ذکر کرنے سے پہلے ہمیں اُن کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اگرچہ "شکریے" کی رسم ہماری صحافت میں اب پامال ہو کر رہ گئی ہے اور "البیان" کو اس عام روش کی تقلید کا کبھی فخر نہیں حاصل ہوا، مگر ہمارا دل چوں کہ اُن کی اوّلین نوازش اور محبت کا شکر گزار ہے، اس لیے زبانِ قلم سے بھی بے ساختہ ادائے تحسین نکل گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود محسوس کریں گے کہ ہمارا اظہارِ تشکر رسمی نہیں، حقیقی ہے!

ڈاکٹر صاحب کا مضمون سامنے آیا تو حیرت ہوئی کہ دینیات پر بھی انہیں گہرا عبور حاصل ہے۔ انہوں نے قرآن مجید سے متعلق جملہ مباحث میں ویسی ہی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، جو اُن کی دوسری تنقیدی تحریروں کا مقبول خاصہ ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس قسم کے مباحث تاریخی اور سماجی ماحول کے تقاضے سے پیدا ہوئے اور اب تک ان ہی عوامل سے متاثر چلے آرہے ہیں۔ موصوف کا یہ خیال بھی قابلِ قدر ہے کہ موجودہ زمانے کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے محض نقلی دلائل پر اکتفا نہیں کی جا سکتی، بلکہ

> "ضرورت اصل میں ایک نئے علم الکلام کی ہے یا یوں کہیئے کہ نئی روش کی ہے۔ یہ درست ہے کہ موضوعِ جدال وہی پرانے ہیں، مگر اسلحہ بدل گئے ہیں"۔

ہمیں خود اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن و دماغ، زمانے کی ہوا سے اس حد تک بدل گئے ہیں کہ جب تک اُن

کے ملحدانہ شکوک، مذہب کے مروجہ اصول تنقید و بحث کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے، کامیابی مشکل ہے، مگر جب تک نیاز ایسے لوگ موجود ہیں جو خود تو یہ کہ کر "نقلی دلائل" کی آڑ لیتے ہیں کہ میں

> کلامِ پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے؟[1]

اور دوسری طرف پکار اٹھتے ہیں:

> "عقلی اعتراضات کا جواب منقولات سے دینا انتہائی کمزوری ہے"[2]

نقلی استدلال کی ضرورت سے بالکل ہی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وحی اور الہام کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے نہایت کامیاب حجت اختیار کی ہے اور بڑے خوب صورت الفاظ میں وحی کے مختلف معانی کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی

> "لغوی معنوں کے بعد انھوں نے (مدیر نگار نے) قرآن کی طرف رجوع کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ وحی کا لفظ چونکہ تنزیل قرآن کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے، اس لیے جہاں اُسے قرآن کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، وہاں بھی اُس سے مراد ویسا ہی عمل ہونا چاہیے۔
>
> یہ اس طرح ہوا کہ اگر یہ کہا جائے کہ پانی چل رہا ہے اور یہ کہ انجن چل رہا ہے یا یہ کہ ہوا چل رہی ہے، یا یہ کہ بھینس چل رہی ہے، یا یہ کہ عورت چل رہی ہے، تو ہر بار چلنے کے فعل سے (مثلاً) پاؤں سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنا ہی مراد لینا چاہیے" گویا "چلنا" سے مختلف تعبیرات

---

[1] نگار جولائی ۱۹۶۲ء۔ [2] نگار ستمبر ۱۹۶۲ء۔

کرنا غلط ہے!

ظاہر ہے کہ محاورۂ زبان کی رو سے ایسا فرض کرنا غلط ہوگا۔ بھینس کا چلنا اور انجن کا چلنا بنیادی طور پر مختلف فعل ہیں۔"

آگے چل کر آپ نے روایات کی روشنی میں وحی کی کیفیت واضح کی ہے اور ان لوگوں کی عینی شہادتوں کے حوالے دیے ہیں جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی حالت میں دیکھا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ نیاز صاحب ان روایات کی صحت سے انکار نہ کر سکیں، دو محکم دلائل کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اعتراض کیا جا سکتا ہے

"یہ روایات غیر معتبر ہیں، لیکن یہ بات ماننے کے لیے وجود در کار ہیں۔ ہم عام مظاہر کے متعلق اس سے کم درجہ روایات و مشاہدات پر اعتبار کر لیتے ہیں اور اگر ایسے معتبر عینی شواہد پر یقین نہیں کرتے، تو پھر تاریخ کے اکثر واقعات بلکہ ہر روایتی واقعہ سے انکار کرنا پڑے گا اور فقط اپنے (چشم دید) مشاہدے ہی کو قابل وثوق گردانا پڑے گا۔"

اگر مدیر "نگار" سچ مچ ایسی روایات کی صداقت سے انکار کر سکتا ہے تو پھر اسے سب سے پہلے اپنی ہی تاریخی تصنیفات کو نذر آتش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب کے مضمون کا تعارف تشنہ رہ جائے گا اگر ہم اُن کے الفاظ ذیل کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول نہ کرائیں:

"سورۂ یونس میں آتا ہے:۔ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَا اِلٰی رَجُلٍ مِّنْھُمْ: کیا یہ اچنبھے کی بات ہے لوگوں کے لیے کہ اُن میں سے ایک آدمی کی طرف ہم نے وحی کی؟ ——— اگر وحی محض "معمولی سوجھ بوجھ" ہوتی یا

شہد کی مکھی کی جبلت ہوتی، تو آں حضرتؐ کے ہم عصر اس پر اتنا تعجب کیوں کرتے؟"
صاحبِ "نگار" کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

"نگار" کا طرزِ دل نگار" مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرت سری کا مضمون ہے، جو آپ نے ہماری درخواست پر "البیان" کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ "البیان" کے ساتھ "بلاغ" کو بھی شامل کر لیا جائے، تو بھی پچھلے ۱۷ برس کے طویل عرصے میں، موصوف کا یہ پہلا مضمون ہے، جسے ہم شائع کر رہے ہیں۔ ہم اس مسرت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں پاتے کہ مولانا نے "البیان" کے دینی مسلک سے اختلاف رکھنے کے باوجود قرآن حکیم کی مدافعت میں ہمارے ساتھ اشتراک فرمایا۔ اس سے یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ تنہا قرآن حکیم ہی ایک ایسی کتاب ہے، جس کی ذات پر مسلمانوں کے تمام فرقے اپنے اپنے فروعی اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک متحدہ محاذ پر جمع ہو سکتے ہیں۔

مولانا کے مضمون سے تعارف کرانے کے لیے خود اُن کا نام ہی کافی ہے۔ مضمون مختصر ہے اور اس کہنہ سنی کے عالم میں اُن سے زیادہ مفصل خیالات کا مانگا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"قرآن بحیثیت کلام الرحمٰن" ——— مولانا محمد منظور نعمانی کا مفصل کلامی مقالہ ہے۔ مضمون عالمانہ ہے اور انھوں نے اس کی ترتیب میں قدیم متکلمین کے اسلوبِ فکر و تحریر سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ شاید اس میں یہ مصلحت ہو گی کہ خود نیاز صاحب کے اعتراضات بھی "مسئلہ خلق قرآن" کے زمانے کے پرانے

اعتراضات ہیں۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، آپ کے مقالے سے پُرانے تعلیم یافتہ طبقے کے شکوک واعتراضات کا ضرور استیصال ہوسکتا ہے، ورنہ نیاز یا اُن کے نیاز مند کی منطقی قابلیت پر یہ بھروسہ کرنا کہ وہ اُن تحریروں سے تسلی حاصل کر پاتو کجا، ان کو سمجھ بھی سکتے ہیں، خارج از قیاس ہی معلوم ہوتا ہے۔ خود صاحب مضمون کو ایک مقام پر یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ ان کی بعض عبارات سے، جو انھوں نے کتب کدام سے نقل کی ہیں، نیاز صاحب پر حجت قائم نہیں کی جاسکتی، جس بے راہ کے نزدیک قرآن بھی "اساطیر الاولین" ہو، اس کے سامنے اقوال سلف کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے؟"

بایں ہمہ یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا کے دقیق مقالے میں بعض بعض باتیں سادہ اور عام فہم بھی ہیں اور اگر ان کے جوابات کو ذرا زیادہ غور و فکر سے دیکھا جائے، تو بہت سے اشکال خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

نیاز کا اعتراض ہے:

"اگر قرآن شریف نام ہے، اُن الفاظ و حروف کا، جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں، جو پریس کے ذریعے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلامِ مجید کا ہر نسخہ کلامِ خداوندی ہے اور جو نسخہ آگ میں ضائع ہوجائے، اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہوگیا۔"

مولانا اپنے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"دیوانِ غالب کے ہر نسخے کو خواہ وہ کسی شخص کے قلم کا لکھا ہو یا کسی پریس کا چھپا ہو، دیوانِ غالب ہی کہتے ہیں — اب اگر دیوانِ غالب کا کوئی نسخہ ضائع ہوجائے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غالب کا کلام ہی ضائع ہوگیا۔"

اسی طرح کلامِ پاک کے نسخوں کے تلف ہو جانے سے کلامِ الٰہی کے
نتیجہ نکالنا "نیاز" ہی جیسے "اربابِ دانش" کا کام ہو سکتا ہے

اسی طرح اور بھی کئی مقامات، اچھی طرح دِل نشین ہو سکتے ہیں ۔ مگر دو ایک جگہ، بالخصوص "لوحِ محفوظ" کی بحث سے ہماری تشفی نہیں ہو سکی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے بھی (جن کا مقالہ زیرِ نظر مضمون کے بعد شروع ہوتا ہے) اس بحث کو تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں مدیر "نگار" نے لوحِ محفوظ پر جس اسلوب سے اعتراض کیا ہے، اُس کی زد ہی قرآن پر نہیں پڑتی۔ مدیر "نگار" کے اصل الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اُس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جنابِ رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں شانِ نزول کہتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے"

یہ اعتراض ہے! اب بجائے اس کے کہ ہم اس کے جواب میں دماغ سوزی کرتے پھریں، نیاز ہی سے کیوں نہ دریافت کریں کہ قرآن مجید کی کس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ازل سے لوحِ محفوظ میں درج تھا؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا مضمون بھی کلامی ہے اور نسبتاً زیادہ سہل اور عام فہم!

"صنعت التفات" کی توضیح سے نیاز صاحب کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ عربی علم و ادب سے کتنے کورے ثابت ہوئے ہیں!

عرشی صاحب کا مضمون "مدیر نگار سے" دسمبر ۱۹۴۰ء کے "البیان" میں شائع ہو چکا ہے، لیکن اب وہی مضمون مزید تشریح و تفصیل کے ساتھ آپ نے دوبارہ مرتب کر دیا ہے۔ اس سے مضمون کی افادیت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

زیر نظر مضمون کے تمام جوابات حشو و زواید سے پاک ہیں۔ چوں کہ ان میں مطلقاً طوالت کو راہ نہیں دی گئی۔ اس لیے ان کا سمجھنا طبیعت کے لیے بار نہیں ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین "البیان" کے لیے اس مضمون کا مطالعہ قندِ مکرر کے لطف کا باعث ہوگا!

سیّد مقبول احمد صاحب بی اے کا مضمون "قرآن کیوں خدا کا کلام ہے؟" مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر نہایت وزنی دلائل رکھتا ہے۔ آپ نے تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کے قصص کو بائبل، یا یہود کے آثار و روایات کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہیں!

آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں انتہائی پسندیدگی اور قبولیت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ اگرچہ "براہین وحی" کا روئے سخن زیادہ تر نیاز کی طرف ہے، لیکن نیاز کے اعتراضات بھی چوں کہ وہی ہیں جو عام معترضین اور مخالفین قرآن کے زبان زد ہیں، اس لیے یہ سمجھنا غلط نہیں ہوگا کہ "براہین وحی" میں عیسائیوں، آریوں، نئی روشنی کے ملحدوں، یہاں تک کہ مشتشرقین یورپ کے اعتراضوں کے جواب بھی آ گئے ہیں۔ ان تمام مسلمانوں کا جن کے ہاتھ میں یہ کتاب جائے، فرض ہے کہ وہ کم از کم ان جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے

سامنے، جو الہامیت قرآن کے بارے میں تشکیک و تذبذب کا شکار ہیں "براہین وحی" کے مطالعہ کی ضرور سفارش کریں۔ (محمد اقبال سلمانی)

طبع ثانی

"براہین وحی" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں رسالہ البیان امرتسر کے خاص نمبر کی صورت میں شایع ہوا تھا۔ تین برس کے بعد ہم اس کا دوسرا ایڈیشن کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

ہمیں بے حد مسرت ہے کہ اس کتاب نے ملک بھر کے بلند پایہ علمی اور دینی جرائد سے خراج تعریف حاصل کیا۔ معارف۔ صدق اور ندیم کے فاضل مدیروں نے صرف ریویو ہی نہ لکھے، بلکہ اپنے اپنے ایڈیٹوریل صفحات میں بھی قرآن مجید کی اس مبارک خدمت کا تذکرہ کیا ——— معارف لکھتا ہے "یہ مجموعہ نہ صرف خرافاتِ نگار کے جواب کی حیثیت سے بلکہ کلام اللہ اور وحی کے متعلق علمی حیثیت سے بھی مطالعہ کے لائق ہے" صدق رقمطراز ہے "یہ نمبر اپنی ضخامت نیز نوعیت کے لحاظ سے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے" "ندیم" کی رائے ہے: "یہ نمبر جامع، وقیع، سنجیدہ اور بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ ہے" روزنامہ "احسان" نے اسے "مسلمانان ہند کی صحیح خدمت" قرار دیا ہے۔ "حمایت اسلام" کا بیان ہے "ہم اسے معاصر "البیان" کی اعلیٰ اسلامی اور پسندیدہ دینی خدمت سمجھتے ہیں" روزنامہ "شہباز" کا ارشاد ہے "یہ مجموعہ ایسے تمام اصحاب کے مطالعہ کے لائق ہے، جو قرآن مجید کو علم و تحقیق کی رُو سے الہامی کتاب دیکھنا چاہتے ہیں" ———

ہم سمجھتے ہیں کہ ان حوصلہ افزا تبصروں ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم کاغذ کے قحط کے اس دور میں دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کر رہے ہیں، خدا کرے کہ جس عزیز مقصد کے لیے ہم اس کی وسیع اشاعت کے متمنی ہیں، وہ بوجہ احسن پورا ہو۔

محمد اقبال سلمانی

نیازیات

{ یعنی نیاز فتح پوری کے وہ مضامین جن میں انہوں نے قرآن مجید
کو غیر الہامی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے؛ }

"قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، صد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے، جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے، دوسری طرف رسول کی عظمت کو"

"سچ پوچھیے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ خود اُس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو"

"اگر قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف خدا کا بنایا ہوا ہے، تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے؟"

"کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر کوئی خدا کلام کر سکتا ہے، تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے"

"کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا، جب تک نطق اس سے متعلق نہ ہو اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اس لیے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق بھی لازم ہوگا، جس کا تعلق یک سر مادیات سے ہے"

"کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں"

"الہام خداوندی کو کسی ایک یا ایک سے زائد مخصوص زبانوں میں محدود کر دینا خدا کی صفت کو محدود کر دینا ہے اور چوں کہ صفاتِ ربانی عین ذاتِ ربانی ہیں، اس طرح گویا خدا کو محدود کر دینا ہوگا، جو عقیدۂ اسلام کے بالکل منافی ہے"

"چوں کہ میں رسول اللہ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، اس لیے قرآن میں واقعہ ابراہیمؑ کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے اسے جھوٹ نہیں بیان کیا یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں بیان کیا، لیکن اس کا اثر نفسِ واقعہ کی صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔ کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اس طرح کی حکایتیں دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ مذاہب کے وجود سے قبل

انسان کے عہدِ وحشت میں بھی جہل و کم فہمی کی وجہ سے رواج پا چکی تھیں، جن کو قرآن نے اساطیر الاولین یا اصنامی روایتوں سے تعبیر کیا ہے۔"

"اس امر کا ثبوت کہ وحی کا تعلق کسی مخصوص زبان سے نہیں ہے، خود کلام مجید سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: فاوحیٰ ربّك الی النّحل ظاہر ہے کہ شہد کی مکھی پر عربی و عبرانی میں تو وحی نازل ہوئی نہ ہوگی، بلکہ اس سے مراد مکھی کی وہ فہم و ذکاوت ہوگی، جس کے زیر اثر وہ پھولوں کا رس جا کر چوستی ہے۔ کلام مجید کو بھی وحی کہتے ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی رسول کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے۔"

"کلام مجید میں تقریباً وہی بیان کیا گیا ہے، جو یہودیوں کی کتاب مرداش ربّا میں پایا جاتا ہے۔ پہلے آپ اسلامی روایت مختصراً سُن لیجیے ..... اب یہودیوں کی کتاب، مرداش ربّا کو سنیے ..... مرداش ربّا کی اس روایت اور اسلامی روایت کا پس منظر بالکل ایک ہے ..... قرآن میں ابراہیم کے باپ کا نام آذر بتایا گیا ہے اور مرداش ربّا کی روایت میں تیراہ ہے ..... بعد کو لوگوں نے زیب داستان کے لئے وہ سب کچھ اضافہ کر لیا، جو مرداش ربّا اور کلام مجید کی روایات میں پایا جاتا ہے۔" (نگار جون ۱۹۴۷ء ملخصاً)

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

"پچھلے مہینے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے ظاہر کیا تھا کہ کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے، خدا کا کلام نہیں۔ اس پر مذہبی حلقوں میں کافی بے چینی ہوگئی اور باوجود اس کے کہ میرا کفر و الحاد اُن کے نزدیک دیرینہ مرض

کی حیثیت رکھتا ہے، اُن کو میری یہ بات بہت ناگوار ہوئی (حالاں کہ مجھے بالکل ناگوار نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص قرآن کو کلام خداوندی کہتا ہے) اور من جملہ دیگر الزامات کے ایک الزام مجھ پر یہ بھی عاید کیا گیا کہ میں خدا اور رسول کی توہین کرتا ہوں۔ میں یقیناً اہل مذہب کے فتویٰ کفر و الحاد کی پروا نہیں کرتا، لیکن مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہوتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں خدا اور رسول کی توہین کرتا ہوں، کیوں کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ خدا کی عظمت اور رسول کی رسالت ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہوں اور میرے نزدیک اہل مذہب ہی کی طرف سے خدا و رسول کی زیادہ اہانت ہوتی ہے

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو خدا کا کلام کہنا نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے، بلکہ اُس صحیح تصورِ وحدانیت کے بھی منافی ہے، جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے۔ میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا، نہ اقوالِ سلف سے، کیوں کہ یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں، بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے؟ اور اگر ہے تو کس مفہوم میں؟

چوں کہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا، اس لیے نامناسب نہ ہوگا، اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی "اشارۂ سریع" یا "الہام بالسرعۃ" کے ہیں۔ اُردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سُوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ فطری ودیعت ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی "خدا کی دین" اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا

جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چوں کہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لیے ہوتا تھا اس لیے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے قلم سے جو کچھ نکلتا تھا، وہ اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔

وحی کا جو مفہوم میں نے متعین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔

سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی یہ ہے کہ وحی انبیاء و رسل کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالاں کہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ	ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں۔

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لیے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے، جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ	ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنی اس فطری ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوب صورت چھتا تیار کرتی ہے ——— جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورہ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝	اُس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے خدا نے اسے وحی نازل کی ہو۔

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی، اس لیے اس کا یہ بیان بہ زبانِ حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم "ماحول واقتضاء ماحول" قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورہ حم میں ارشاد ہوتا ہے:

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا	پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دے دیا اور ہر آسمان میں اُس کے نظم و انصرام کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی وہی ودیعت کرنے کے ہوئے!

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے، جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے، لیکن آپ سُن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بُری باتوں کے لیے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفسِ انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا	یعنی اس میں بُرائی بھلائی الہام کی۔

یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں

استعمال ہوا ہے۔

لفظِ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔	اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن ساتھ لگا دیے ہیں اور یہ وہ شیاطین ہیں، جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی "بُری بات سمجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی، جو مختلف جگہ پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمالیجیے!

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝	رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا، بلکہ وہ جو کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اُسے سکھایا ہے۔

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے جاتے ہیں:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ۔	مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے میں تمھیں بُری باتوں کی طرف ڈراؤں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ۔	قرآن مجید تمھاری طرف حکمت سے نازل کیا گیا ہے۔

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے :-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔

اے رسول! کہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں، جو مجھے وحی کیا جاتا ہے۔

ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے، لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی انسان اس سے ہم کلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفت و گو کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحی کے ذریعہ سے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ۔

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰؑ خدا سے باتیں کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا؟ اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے۔ لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلامِ پاک کی پیش کی جاتی ہیں، پہلے انہیں سن لیجیے!

سورۂ زخرف کی آیت ہے :

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس اُم الکتاب کا ایک حصّہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔

یہ اُم الکتاب ہے؟ اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ | یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اُم الکتاب کا ایک حصہ ہے۔ جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے، لیکن جس وقت ہم سورۂ رعد[1] کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں، تو ہم کو "لوح و ام الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ط

اس آیت میں "ام الکتٰب" کو "آیاتِ محکمات" سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی "مضبوط و مستحکم نشانیاں" یا بہ الفاظِ دیگر وہ قوانینِ فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح اور تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بنا پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمایئے، جو قرآن کے اُم الکتاب اور لوحِ محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو:

عرشِ اعظم سے نیچے اُس نے ایک دانۂ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوحِ محفوظ بنائی۔ اس لوح کا طول ۷۰۰ سال کی راہ اور عرض تین سو برس کی راہ تھا۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت

---

[1] معلوم نہیں، راہ کس کی مراد ہے، انسان کی، طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی؟ (نیاز) [1] رعد نہیں بلکہ آل عمران (مدیر البیان)

کی منبت کاری کی تھی، بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ "لکھ اے قلم! میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہوگا، اس کے متعلق میرے علم کا حال"۔

قلم نے پہلے لوح محفوظ پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا، یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادّی تختی تھی، جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوش نویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گل کاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں زبور، توریت، انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی، ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو، کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی خیال توریت میں منتقل ہوا۔ جیسا کہ کتاب استثناء باب ۱۰ آیۃ الغایت ۵ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی ہی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں، جیسی اس نے توڑ دی تھیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے"۔ اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا، چنانچہ عبرانی

زبان میں جو لفظ تختی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ وہی ہے، جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چوں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے تورات و انجیل لوحِ محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے، اس لیے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن، تورات و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوحِ محفوظ میں درج ہونا چاہیے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑ لی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوحِ محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے، جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے۔ اب درایتی حیثیت سے دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے، جس سے ایک طرف خدا کے تصورِ وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظِ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی صفتِ نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے اس تصورِ وحدانیت کے منافی ہے، جو مادیت کے بعید ترین خیال سے بھی پاک و منزّہ ہے۔

گفت و گو، نطق، الفاظ ان سب کے تخیّل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ اُن تمام

آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لیے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے، تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چالتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاقی کے لیے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرکے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے، بلکہ سچ پوچھیے، تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغام بر کی حیثیت دینا، جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکیہ کی سی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے، جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو؟ جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو۔ فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے۔ اس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب

احکام صادر کرے، کیوں کہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بنایا ہوا ہے، تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے، تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوتِ اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوحِ محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے، بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے قرآن میں جہاں جہاں "کلام اللہ" اور "کلمات اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اُن سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے اُن کی پوجا نہیں کرائی، بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو رسول کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے، جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔" (نگار، جولائی ۱۹۴۰ء)

علماءِ کرام جواب دیں

"بہر حال میرے دل میں جو شبہات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں، ان کو یہاں بیان کرتا ہوں، اور علماء کرام سے التماس کرتا ہوں کہ وہ ان کے دُور کرنے کی کوشش فرمائیں:

۱۔ قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے؟ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا، حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اوّل صورت مانی جائے، تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا، لیکن "شئے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شیئٍ ھالك الّا وجہہ" اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لیے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں، جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلامِ خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

۳۔ اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے، تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفاتِ خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے، اس لیے لامحالہ اسے "صفتِ ربانی" ماننا پڑے گا، لیکن چوں کہ ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے، اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

۴۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطقِ خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آں حضرت تک پہنچایا گیا تھا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں، جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا

رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

۵۔ قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا، وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے، اس لیے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظِ ترتیب مختلف ہے، جو لوحِ محفوظ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیے۔

۶۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف بنجما بنجما نازل ہوا ہے، یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے، جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی، اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

۷۔ اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا، تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو لفظِ قُلْ سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درآں حالے کہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی

تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے؟ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کرلی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

۸۔ اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے، تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے، جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں "الحمد للہ" سے لے کر "مالک یوم الدین" تک دعا کا انداز ایسا ہے، گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتہً "ایاک نعبد" سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جارہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی، تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

۹۔ قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے، دراں حالے کہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

۱۰۔ خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفتِ نطق کا

ذکر کیا جائے، تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو، جو الفاظ کا محتاج ہے جس طرح اُس کو سننے اور دیکھنے کے لیے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں اسی طرح کلام کے لیے زبان یا الفاظ سے اُسے بے نیاز ہونا چاہیے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند من جملہ اور شبہات کے، جن کی بنا پر میں قرآن پاک کو "منطوقِ خداوندی" نہ سمجھنے پر مجبور رہوں، لیکن اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلامِ خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے، تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدائے علیٰ وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کیے، جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔"

("نگار" اگست ۱۹۴۰ء)

کیفیّتِ وحی

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

علامہ اقبال کہ بقول مولانا گرامی مرحوم:

پیغمبریؒ کرد و پیمبر نتواں گفت

خود ایک صاحبِ الہام شاعر تھے۔ کیفیتِ وحی کے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان اہلِ نظر کے لیے ایک حدتک "تجربی بصیرت" کا حکم رکھتا ہے جو ان کی کتاب "تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ" سے ماخوذ ہے۔ (مرتبؔ)

علم النفس جدید نے حال ہی میں متصوّفانہ شعور و معرفت کی کنہہ کی طرف توجہ کی ہے۔ اس بلاواسطہ شعور و آگہی کے ذریعے سالک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر یہ شعور و احساس ناقابلِ تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکسی پرتو کا نتیجہ ہے۔ اس شعور و احساس کی کیفیت کسی دوسرے کے پاس بیان کرنا بھی مشکل ہے:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی

پیغمبر کا یہ احساس فہم و ادراک کا بھی عنصر رکھتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا یہ احساس خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احساس کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوّت پر جاری ہوا۔ احساس دراصل

ایک خارجی چیز (Out ward pushing) کا قلب پر وارد ہونا اور خیال اس کے اظہار (Out ward reporting) کا ذریعہ ہے۔ غیر لفظی اور گونگا احساس اپنے منشا کو خیال کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے۔ گویا یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ خیال اور لفظ دونوں بہ یک وقت رحم احساس سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ خیال الفاظ سے معرّا نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا و آفرینش کے اعتبار سے دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ گویا لفظ بھی ملہم ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن لفظاً و معناً کلامِ الٰہی ہے۔"

(مترجمہ رازی" ۱۴۱ے)

کیا قرآن رسول کا کلام ہے؟

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

اگر کوئی مسلمان نہ ہو یا خدانخواستہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق اور راست باز تسلیم نہیں کرتا، تو اس کے لیے اپنی غلط فہمی سے بے شبہ یہ کہنے کا موقع ہے کہ قرآن پاک خدا کا نہیں، بلکہ رسول کا کلام اور انسانی تعلیم سے ماخوذ ہے، لیکن ہمارا مخاطب ایک ایسا شخص ہے، جو اپنے کو مسلمان کہنے اور مسلمان مانے جانے پر مُصر ہے اور ساتھ ہی حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو صادق اور راست باز تسلیم کرتا ہے اور اس کے باوجود یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ قرآن پاک خدا کا نہیں، بلکہ رسول کا کلام ہے اور انھوں نے یہود و نصاریٰ کی سُنی سنائی باتوں کو اپنے قرآن میں درج کر دیا ہے۔

جو شخص اپنے کو مسلمان کہ کر یہ خیال رکھتا ہو، وہ قطعاً اسلام کے دائرہ سے خارج ہے، کیوں کہ وہ ایک ایسے بنیادی اصول کی جڑ کھودنا چاہتا ہے، جس پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے! اور جو اسلام کا مسلّمہ عقیدہ اور یقینی تعلیم اور متفقہ فیصلہ ہے، جس پر جب سے اسلام ہے، تمام اُمّت کا متفقہ، مسلّمہ اور ناقابل شک یقین کامل ہے۔

جو چیز ایسی یقینی اور مسلّم ہو، اس پر دلیل قائم کرنا اور دلیلوں کے ذریعہ سے اس پر ایمان کا مطالبہ درحقیقت اس یقین کی کم زوری کا نشان ہے۔ آفتاب کے طلوع پر دلیل مانگنا اپنی نابینائی کا آپ اعلان ہے۔

اسلام کی ساڑھے تیرہ سو برس کی زندگی میں سینکڑوں فرقے پیدا ہوئے مگر اس اصول پر سب کے سب متفق تھے، کیوں کہ جو اس اصول پر متفق نہیں وہ اسلام کے دائرہ ہی میں شامل نہیں، وہ کسی فرقہ میں کیا شمار پاتا؟

کیسے افسوس کی بات ہے کہ آج نام کے مسلمانوں میں ایک ایسے بلند خیال محقق پیدا ہوئے ہیں، جو گو مشرق و مغرب کے ہر علم و فن سے کورے ہیں، پھر بھی ہمہ دانی کا یہ دعویٰ ہے کہ مشرق و مغرب کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جس میں اجتہاد کا دعویٰ نہ ہو۔

ان صاحب نے شائد ۱۹۰۰ء میں جب وہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔ اپنے باپ کے ساتھ جو دار العلوم کے مطبخ اور دار الاقامہ میں منشی کی خدمت پر ایک دو مہینے کے لئے نوکر ہوئے تھے، دار العلوم کے احاطہ میں داخل ہو کر چند ابتدائی کتابیں صرف شروع کی تھیں، اس پر اتنا بڑا جھوٹ وہ بولے ہیں کہ انہوں نے دار العلوم ندوہ میں علوم کی تکمیل کی ہے (جیسا کہ انھوں نے مصنفین اردو کی فہرست مطبوعہ کتاب گھر حالی پبلشنگ ہوس دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھ کر چھپوایا ہے ص۱۳۵) کیا اس کے بعد ان کی اخلاقی حالت اس قابل سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ حقائق اسلام پر گفت گو فرمائیں اور مسائل میں مجتہدانہ رائے کے اظہار کی جرأت کریں؟

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں صاحب مذکور نے اپنی تعلیم کا دوسرا مقام رام پور لکھا ہے، جہاں اُن کے والد نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا لیکن وہاں بھی ان کی تعلیم ہدیہ سعیدیہ اور مختصر المعانی سے آگے نہیں ہو سکی اور یہ کتابیں بھی ان کی بنیادی کم زوری کے سبب سے ان کی سمجھ سے باہر تھیں،

جیساکہ ان کے ساتھیوں کا بیان ہے۔

یہ ہے ان صاحب کی مشرقی علوم و فنون کی تکمیل اور تبحر کا سارا افسانہ! اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھ کر پولیس کی نوکری کی اور وہاں سے الگ ہو کر یا الگ کیے جانے پر دوسروں کی کمائی کو اپنانے میں اپنے کمال کا اظہار کیا اور حقائقِ قرآنی اور نکاتِ دینی پر لب کشائی کی جرأت کی:

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اگر ایسا شخص علانیہ اسلام سے ارتداد کر لے یا یہودی، عیسائی اور آریہ ہو جائے، تو ہم کو کچھ دکھ نہ ہوگا، کیوں کہ یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ اسلام سے غداری کر کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو گیا، لیکن غم تو اس کا ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اسلام کے قلعہ میں بیٹھ کر دشمنوں کے حق میں اسلام کے خلاف تبلیغ میں مصروف ہے اور اس کے سبب سے مسلمان دو طرفہ حملوں میں گھرے ہیں۔ ایک دشمنوں کے حملے کا جواب اور دوسرا دوست نما دشمنوں کے حملوں کی روک تھام جس فوج کی صف کے اندر یہ خانہ جنگی برپا ہو، اس کی کامیابی کا یقین کوئی کیوں کر کرے؟

شخص مذکور دراصل تو قرآن پاک کو خدا کا کلام اس لیے نہیں مانتا کہ وہ خدا کی ذات و صفات کے یقین سے محروم، نبوت و رسالت کی حقیقت سے بے گانہ اور وحی و الہام کے عقیدہ سے ناآشنا ہے، مگر ظاہر یہ کرتا ہے کہ اس لیے نہیں مانتا کہ

۱۔ اس سے لازم آئے گا کہ خدا کی زبان اور منہ ہو۔

۲۔ اگر قرآن پاک محمد رسول اللہ صلعم کی تصنیف نہ ہو، رسول اللہ صلعم کی دماغی بلندی اور ذہنی کمال کا ثبوت کیا ہوگا؟ (نعوذ باللہ)۔

۳۔ قرآن نے اپنے کو کہیں کلام اللہ نہیں کہا ہے۔

ان خرافات کی تردید کی چنداں ضرورت نہ تھی، مگر اس لیے تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہم کو جواب نہیں دیا گیا، چند سطروں کے لکھنے کی ضرورت ہے۔

صفتِ کلام | دراصل یہ مسئلہ صفاتِ الٰہی کے مسئلہ کی ایک کڑی ہے۔ دنیا میں کوئی شے صفات سے خالی ہو کر نہیں پائی جا سکتی۔ عرصۂ ہستی میں اوپر سے نیچے تک جو چیز بھی ہے، وہ چند صفات سے متصف ہی ہو کر پائی جا رہی ہے، اسی اصول کے ماتحت وہ ہستی اقدس بھی جس سے ساری دنیا کی ہستی ہے صفات سے دی ہیں علماء اہل سنت اور غیر اہل سنت میں اختلاف اس میں ہے کہ ان صفات کا منشا خود ذاتِ الٰہی ہے یا ذات سے علیحدہ ہو کر وہ صفات اس میں اسی طرح پائے جاتے ہیں، جیسا کہ ممکنات میں ہم کو نظر آتے ہیں۔

بہرحال جو پہلو بھی اختیار کیا جائے، صفاتِ الٰہی کے منشاء اور اثار کے ظہور سے کسی فرقہ بلکہ مطلقاً کسی مذہب کو انکار نہیں، اسی بنا پر ہم خدا کو سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) متکلم (بولنے والا) مرید (ارادہ کرنے والا) اور قادر (قدرت والا) یقین کرتے ہیں۔ اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں، جو یہ کہے کہ جب وہ سنتا ہے، تو اس کے ہمارے جیسے کان بھی ہوں گے۔ وہ دیکھتا ہے تو ہماری جیسی اس کی آنکھیں بھی ہوں گی۔ وہ بولتا ہے، تو ہماری جیسی اس کی زبان بھی ہوگی۔ اسی طرح دوسری صفات کا فرق ہے۔

ان صفات کی تعبیر دو طریقوں سے کی گئی ہے:

۱۔ صفات عینِ ذات ہیں، یعنی خود ذات میں ان صفات کا منشاء

پایا جاتا ہے۔ خدا کو "سمیع" کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جن باتوں کا علم ہم کو کانوں سے سُن کر ہوتا ہے، خدا کو اُن کا علم ہے۔ "بصیر" اس لیے کہتے ہیں کہ جن چیزوں کو ہم دیکھ کر محسوس کرتے ہیں، اُن کو بھی خدا جانتا ہے اور "متکلم" اس لیے کہتے ہیں کہ ہم اپنے جن اندرونی خیالات اور مافی الضمیر کو اپنی زبان کی حرکت اور آواز سے دوسروں پر ظاہر کرتے ہیں، خدا بھی اپنی ان باتوں سے دوسروں کو اطلاع بخشتا ہے اور یہی اس کا کلام ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کے اظہار کے جو آلات ہم میں پائے جاتے ہیں، ان ہی نوعیتوں کی چیزیں اللہ تعالیٰ میں بھی پائی جاتی ہوں گی اور اسی ادنےٰ تعلق سے خدا کے ہاتھ کو ہاتھ، آنکھ کو آنکھ، سننے کو سُننا اور بولنے کو بولنا کہتے ہیں۔ اُس کے ہاتھ ہیں، مگر ہماری طرح نہیں۔ کان ہیں، مگر ہماری طرح نہیں۔ وہ کلام کرتا ہے، مگر ہماری طرح نہیں، کیوں کہ وہ خود اور اس کی ساری صفتیں قرآن کے اس اصول کے تحت میں ہیں:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ-۲) | اس جیسی کوئی چیز نہیں۔

بہ ہر حال ان میں سے جو پہلو بھی اختیار کیا جائے، صفاتِ الٰہی کا منشا پورا ہوگا۔ اب جو شخص کسی کو اپنے مافی الضمیر سے متعیّن اشاروں کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ یا کسی قاصد کے ذریعہ یا تار، ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ یا مسمریزم میں معمول میں اپنی تاثیر کے ذریعہ جو اطلاع دوسروں کو دیتا ہے وہ اطلاع یا کلام ذریعہ کا نہیں ہوتا، وہ اصل متکلم یا کاتب کا ہوتا ہے۔ ان درمیانی ذریعوں کا کام صرف ایصال ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اپنے ارادہ، اطلاع اور حکم سے جو اطلاع بخشتا ہے، وہ کلام الٰہی ہے، کلام رسول نہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں علم کی دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں

یہ آلات جن کے ذریعہ سے ہم اظہارِ مدعا کرتے ہیں، بے جان اور بے ارادہ ہیں۔ ہم جس طرح چاہتے ہیں، ان کو استعمال کرتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کی یہ صورت نہیں۔ وہ ارادہ رکھتے ہیں، لیکن اُن کا یہ ارادہ تمام تر حکم الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے ان انبیاء علیہم السلام میں جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ میں لکھا ہے، دو قسم کی علمی استعدادیں رکھی ہیں، ایک تو قوانین شریعت کا وہ اصولی علم جس کے ذریعہ سے وہ کلیات کے تحت میں جزئیات پر حکم لگاتے ہیں۔ قوانین الٰہی کا یہ علم ان میں اسی طرح ودیعت رکھا جاتا ہے جس طرح انسان، حیوان، چرند، پرند غرض تمام انواع میں کچھ فطری علم ودیعت رکھ دیا جاتا ہے۔ انسان کے بچّہ کو دُودھ پینا کون سکھاتا ہے؟ حیوانات کے بچّوں کو چرنا اور مچگنا کون بتاتا ہے؟ پرندوں کے بچّوں کو اُڑنا۔ آبی جانوروں کے بچّوں کو تیرنا کون تعلیم کرتا ہے؟ وُہی خالق فطرت! اور حاکم خلقت! اسی کو وحی فطری کہتے ہیں۔ مثال کے لیے انسانوں میں فطری شاعر، فطری موجد، فطری مقنّن، فطری ریاضی دان کا وجود کافی ہے۔

حضرات انبیاءؑ کے اس ذریعۂ علم کو ملکۂ نبوّت اور فہم نبوی بھی کہہ سکتے ہیں اور وحی خفی بھی اس کا نام رکھ سکتے ہیں اور یہی ذریعۂ علم انبیاءؑ کی جبلّتی علم کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا علم وہ ہے جو وقتاً فوقتاً انبیاء کو ان کے

کسب و نظر اور عملِ تفکیر کے بغیر بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوتا ہے۔ اِس ذریعۂ اطّلاع میں انبیاءؑ اُسی طرح بے جان اور بے ارادہ آلات کی طرح ہیں، جن کی مثال اوپر دی گئی ہے۔ یہی وحی جلی ہے اور یہی کلامِ الٰہی ہے اس طریق پر انبیاءؑ کو جو علم ہوتا ہے، وہ انبیاءؑ کا نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے، کیونکہ اس علم کے پانے میں ان کا عملِ تفکیر یا قوتِ ذہنی یا تجربہ و مشاہدہ کام نہیں کرتا، بلکہ وُہی پاتے ہیں، جو اُن کو اوپر سے دیا جاتا ہے اور وُہی سُنتے ہیں، جو آسمان سے سُنایا جاتا ہے[1]۔ یہ یہود و نصاریٰ کی سُنی سُنائی باتوں اور رائج الوقت افسانوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ)۔

انبیاءؑ کے علم کا ماخذ انبیاء علیہم السّلام کی یہ دونوں علمی قوتیں انسانوں سے ماخوذ نہیں اور نہ وہ انسانوں کی سُنی سُنائی باتوں کو دہراتے ہیں۔ وہ خدا سے علم حاصل کرتے ہیں اور غیب کے خزانہ سے پاتے ہیں، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بہ تصریح فرمادیا ہے کہ وہ کیوں کر انبیاء علیہم السّلام کو اپنے حکم و اطّلاع سے باخبر کرتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (شوریٰ ۵)

اور کسی آدمی کی تاب نہیں کہ اللہ اُس سے دو بدو کلام کرے، لیکن یہ کہ وہ الہام کردے یا پردہ کے پیچھے سے بات کرے یا کوئی قاصد بھیجے، جو اللہ کے حکم سے اللہ کی مشیت کا پیغام اس کو پہنچا دیتا ہے اللہ کی شان بڑی ہے اور وہ حکمت والا ہے۔

---

[1] اس اجمال کی پوری تفصیل سیرۃ النبی صلعم کی تیسری جلد میں ہے۔ قرآن پاک کی آیتیں اور ائمہ کے اقوال بھی اس میں درج ہیں۔

ان آیتوں میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر سے یوں باتیں نہیں کرتا، بلکہ اپنی باتوں سے دوسروں کو مطلع کرنے کے لیے وہ تین طریقوں سے کام لیتا ہے:

۱۔ الہام اور القا، یعنی آواز اور قاصد کے بغیر خود بہ خود بلا واسطہ وہ قلب میں ڈال دیتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ اس علم کو قلبِ انسانی میں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو احادیث میں "نفث فی الروع" کہا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پردہ کے پیچھے سے یعنی غیب سے کوئی آواز آتی ہے جس کو نبی سنتا ہے، لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ یا قاصدِ الٰہی نبیوں کے پاس خدا کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہ ان کو سکھا اور بتا جاتا ہے یا قلب میں اُتار جاتا ہے۔

نکتہ | آیت بالا کا اخیر ٹکڑہ جس میں اللہ تعالیٰ کی رفعتِ شان اور حکمت بینی کا ذکر ہے، اس موقع پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کی بلندی اور علو و رفعت تو اس کی مقتضی ہے کہ کسی بشر کی یہ مجال نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے کلام کا شرف بخشے کہ وہ علی ہے، لیکن چوں کہ وہ حکیم بھی ہے، اس لیے اس نے اپنی رفعت اور بلندی کے باوجود بہ مقتضائے حکمت وحی کے یہ تین طریقے پیدا کیے، جن کے ذریعہ سے وہ اپنے علم و مشیت سے بندگانِ خاص کو آگاہ فرماتا ہے۔

احکامِ الٰہی وحی کے ان تینوں طریقوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے ہیں یعنی وحی بلا آواز و واسطہ اور وحی بہ آواز غیب اور وحی بہ ذریعۂ قاصد و فرشتہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان ہی اوپر کی آیتوں کے بعد

ان سے متصل ہی ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شورٰی)

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے دین کی روح[1] (قرآن) وحی کی تو (پہلے) جانتا بھی نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا چیز ہے؟ لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا ہے، جس سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، راہ دکھاتے ہیں۔

یہ آیت وحی کے اقسامِ ثلاثہ کو جامع ہے (تفسیر روح المعانی میں ایک قول) اب خاص قرآن پاک کی نسبت آیتیں ملاحظہ ہوں۔

سورۂ بقرہ میں ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (بقرہ)

کہ دے کہ جو جبریلؑ کا دشمن ہے (تو وہ ہو اس سے قرآن کی صداقت پر حرف نہیں آتا) کیوں کہ اس نے (اے محمدؐ!) تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس (قرآن) کو اتارا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (شعراء)

یہ (قرآن) سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے اس کو روح الامین فرشتہ لے کر تیرے قلب پر اترا ہے تاکہ تو عربی زبان میں خدا کا ڈر سنانے والوں میں سے ہو۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ

اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم رکھتے ہیں اور خدا زیادہ جانتا ہے، جس کو وہ اتارتا ہے۔

---

[1] بعضوں نے رُوْحًا کی تفسیر رحمۃ کی ہے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۔ (نحل ۱۴)	تو یہ کافر کہتے ہیں کہ تو خدا کے نام سے بنا کر لاتا ہے (خدا پر افترا کرتا ہے) یہ لوگ جہالت سے ایسا کہتے ہیں۔ اے رسول ؐ! ان کے جواب میں کہہ کہ روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اس کو اتارا ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۔ (طٰہٰ)	جو وحی کیا جاتا ہے، اُس کو سُن!

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشادِ ربانی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ (قیامۃ)	اپنی زبان کو اس غرض سے قرآن کے الفاظ کو (سُن کر) مت ہلا کہ اس کو جلدی لے لے، ہم پر ہے اس کا یاد کرانا اور پڑھنا۔

ان تمام آیتوں سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک فرشتۂ الٰہی کے ذریعہ سے محمد رسول اللہ صلعم کے قلبِ مبارک پر اُترا اور گوشِ مبارک میں بھی آیا۔ اس کے معلومات کا سرچشمہ انسانی قصص و حکایات اور بشری علم و تجربہ اور سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ اب خاص قصصِ قرآنی کی نسبت ہم کو دیکھنا ہے کہ کیا قرآن پاک اس کا ماخذ یہود و نصاریٰ کی سُنی سنائی باتوں کو قرار دیتا ہے یا فیضانِ الٰہی اور تعلیمِ ربانی کو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے شروع میں ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ	ہم نے قرآن کو عربی میں اُتارا ہے، تاکہ تم سمجھو ہم تم کو اچھی طرح بیان کر کے ایک قصہ اس لیے سناتے ہیں کہ ہم نے تمہاری طرف قرآن کو

اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف)	وحی کیا ہے اور تم اس سے پہلے ناواقف تھے۔

آخر میں ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ط (یوسف)	یہ غیب کی باتوں میں سے ہے، ہم تمہاری طرف اس کو وحی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے:

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (قصص)	اور تو مدین کے رہنے والوں میں سے نہ تھا کہ اُن پر ہماری آیتوں کو پڑھ کر سناتا لیکن ہم ہیں بھیجنے والے اور تو طور کے کنارے نہ تھا جب کہ ہم نے پکارا لیکن تیرے پروردگار کی رحمت سے تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے، جس کے پاس ڈرانے والے نہیں آئے تجھ سے پہلے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

اسی قصہ کے موقع پر خدا فرماتا ہے:

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ ط (قصص)	ہم موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ سچائی کے ساتھ تم کو سناتے ہیں۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (آل عمران ۵۰)	یہ غیب کی خبروں میں ہے ہم اس کو تمہاری طرف وحی کرتے ہیں اور تم جب وہ لوگ اپنے قلم (قرعہ کے لیے) ڈال رہے تھے کہ ان کے پاس نہ تھے۔

دیکھا کہ قرآن پاک نے اپنے قصص کا ماخذ انسانی ذرائع کو نہیں، بلکہ ربانی سرچشمۂ علم اور غیب کی طاقت کو بتایا ہے۔

آخر میں ہم ایک "مسلمان" کی عبرت کے لیے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب سے ایک بیان نقل کرتے ہیں، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک "زبردستی کے مسلمان" نے جو بات کہی ہے، وہ حرف بہ حرف عیسائیوں سے ماخوذ ہے اور اس کا جواب ایک "جنم کے مسلمان" سے بہتر ایک نومسلم فرینچ نے دیا ہے:

"عیسائیوں نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے بہت کوشش کی کہ آنحضرتؐ پڑھے لکھے تھے۔ تورات اور انجیل سے واقف تھے اور جرجیس نام ایک عیسائی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے، تو خدا کی نسبت آں حضرتؐ کا یہ خیال پیدا ہونا اور بھی زیادہ بعید بلکہ محال تھا، کیوں کہ اُس زمانہ کی تورات و انجیل اور عیسائی معلم اُسی خدا کی تلقین کر سکتے تھے، جو خود اُن کا خدا تھا۔ فرانس کا مشہور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری اپنی کتاب اسلام میں لکھتا ہے:

"ان روایات کا پتہ لگانا، جن سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلعم نے عیسائیوں، یہودیوں اور ستارہ پرستوں کے عقائد بالمشافہ حاصل کیے تھے، فائدہ سے خالی نہیں، کیوں کہ اس سے اُن مقامات کی تشریح ہوتی ہے، جہاں قرآن اور تورات کی آیتیں ہم مضمون ہیں، لیکن پھر بھی یہ درجۂ دوم کی بحث ہے، کیوں کہ گو یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن آسمانی کتابوں سے ماخوذ ہے، لیکن یہ مشکل حل نہیں ہوتی کہ محمدؐ میں یہ مذہبی روح کیوں کر پیدا ہوئی اور وحدانیت کا ایسا مضبوط اعتقاد کیوں کر پیدا ہوا، جو اُن کے جسم و روح پر بالکل چھا گیا؟"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

"یہ محال ہے کہ یہ اعتقاد تورات اور انجیل کے مطالعہ سے پیدا ہوا، اگر محمدؐ نے ان کتابوں کو پڑھا ہوتا، تو ان کو اٹھا کر پھینک دیا ہوتا کیوں کہ وہ اُن کی فطرت اور وجدان اور مذاق کے مخالف تھیں۔ اس قسم کے اعتقاد کا محمدؐ کی زبان سے ادا ہونا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور وہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رسول صادق اور پیغمبر مامون تھے" (الکلام ص۱۳۲)

آخری سوال یہ ہے کہ خود محمد رسول اللہ صلعم نے جو مخاطب کے نزدیک صادق اور راست باز تھے، اس قرآن کی نسبت کیا دعویٰ کیا ہے؟ آیا یہ کیا ہے کہ وہ میری بنائی ہوئی انسانی کتاب ہے یا یہ کہا ہے کہ وہ حرف بہ حرف اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے، جو محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ انسانوں کو ملا ہے؟ اس بحث کے فیصلہ کے لیے خود قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا کافی ہوگا۔

قرآن پاک کا دعویٰ کہ وہ خدا کا کلام ہے، سورۂ بقرہ میں یہود کے تذکرہ میں ہے کہ وہ خدا کا کلام سُننے کے بعد اس میں تحریف کرتے تھے:

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (بقرہ)	یہودیوں میں ایک گروہ ہے، جو اللہ کے کلام کو سُن کر پھر اس میں تحریف کرتے ہیں، اس کے بعد کہ وہ اس کو سمجھ چکے اور وہ جانتے ہیں۔

کلام اللہ سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن پاک ہے، جس کو سُن کر اور سمجھ کر یہودیوں کا ایک گروہ اس کے لفظوں اور معنوں میں تحریف کرتا تھا اور اس کو یا تو اپنے غلط مقصد کے مطابق بنانا چاہتا تھا یا اس سے خلافِ مقصود معنی نکال کر اس پر اعتراض کیا کرتا تھا۔

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہاں کلام اللہ سے مراد تورات ہے۔ یہود

اس کے مطلب میں تحریف کرتے تھے، مگر اس سے مسلمانوں کے استدلال میں کوئی فرق نہیں آتا، کیوں کہ کلام اللہ ہونے میں تورات اور قرآن اور تمام دوسرے صحفِ الٰہی برابر کے شریک ہیں، جو معنی ایک کے کلام اللہ ہونے کے ہیں، وہی سارے صحفِ الٰہی کے کلام الٰہی ہونے کے ہیں۔

۲۔ سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشادِ مبارک کو جو قرآن پاک میں وعدہ کی صورت میں وارد ہوا تھا، کلام اللہ فرمایا ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ (فتح) | وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔

یعنی منافقین جو غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے، وہ چاہتے تھے ارشادِ الٰہی کو بدل دیں۔

۳۔ کفار جو گرفتار ہو جائیں، ان کو قرآن سنا کر تبلیغ کا فرض ادا کرنا چاہیے

فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (توبہ) | تو تم اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے۔

۴۔ قرآن پاک کی نسبت بار بار اعلان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (واقعہ حاقہ) | پروردگار عالم کا اتارا ہوا۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء) | یہ قرآن بے شک پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (زمر و جاثیہ) | غالب اور حکمت والے خدا کی اتاری ہوئی کتاب۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (مؤمن) | غالب و دانا خدا کی اتاری ہوئی کتاب۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (یٰسین) | اس غالب رحم والے کا اتارا ہوا۔

تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (فصلت) | رحمت والے رحیم کا اُتارا ہوا۔
تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (فصلت) | حکمت والے، خوبیوں سے بھرے ہوئے کا اُتارا ہوا۔

وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان

شخص مذکور نے بکمالِ تفاخر قرآنِ پاک کی اُن چند آیتوں سے جن میں بعض جانور اور بعض غیر پیغمبروں کی طرف وحی کی نسبت ہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحیٔ "برمحل سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا نام ہے، حالاں کہ برمحل سوجھ بوجھ سے مقصود وہ علم ہے، جو انسان کو غور و فکر و استدلال اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور وہ کسب و نظر اور حواس کا فیض ہے اور صحت و خطا دونوں کا مورد ہے اور وحی اُس علم کا نام ہے، جو خدا کی جانب سے بندہ کو بندہ کے غور و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کے بغیر عطا ہوتا ہے اور وہ سراپا یقین اور یک سر صحیح ہوتا ہے، جس میں خطا کا امکان ہی نہیں اور اس کو ہر خطا سے محفوظ رکھا جاتا ہے:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حٰمٓ سجدہ ۱-۵)

اور یہ وہ زبردست کتاب ہے کہ باطل جس کے نہ سامنے سے اُس کے پاس پہنچ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، ایک حکمت والے، خوبیوں والے (خدا) کی طرف سے اُتری ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ

خدا غیب کا دانا ہے، وہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا، لیکن رسولوں میں سے جس کو پسند کرے، تو وہ چلاتا ہے اس کے

وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝ (جن-۲)	سامنے اور اس کے پیچھے سے نگاہ بان تاکہ ظاہر کرے کہ ان رسولوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کو پہنچا دیا اور اُس نے اس کے پاس جو ہے، اس کو گھیر رکھا ہے اور ہر چیز کو گن لیا ہے۔

اور اسی لیے وہ الحقّ ہے، یعنی، یقینی اور سچی:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ (آل عمران-۶)	یہ سچی بات تیرے پروردگار کی طرف سے ہے، تو تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

خاص قرآن پاک کی نسبت ہے:

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (رعد-۱)	یہ ہیں آیتیں کتاب کی اور وہ چیز جو اُتاری گئی ہے تیری طرف تیرے رب کی طرف سے، وہ سچ اور یقینی ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔
وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ (سبا-۱)	اور جن کو علم دیا گیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جو تیری طرف تیرے پروردگار کی طرف سے اترا ہے، وہ ہی حق ہے۔
وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۙ (مائدہ-۷)	اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری۔
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۙ (زمر-۱)	ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اُتاری۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (زمر۔ ۴)	ہم نے تجھ پر یہ کتاب لوگوں کے لیے سچائی کے ساتھ اُتاری۔

اِسی معنی کی اور بہت سی آیتیں قرآن پاک میں ہیں، اُن سے واضح ہوگا کہ قرآن پاک کا یہ عمومی دعویٰ ہے کہ اس میں جو کچھ ہے، وہ یک سَر حق، تمام تر صداقت اور سراپا یقین ہے۔ یہ "انسانی سوجھ بوجھ" نفسانی تاثر اور یہود و نصاریٰ کے "مسروقہ مضامین" نہیں ہیں۔

سورۂ ہود میں ایک آیت ہے، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص اسی قسم کے خرافات نگار کی تردید میں ہے، ارشاد ہے:

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (ھود ۲)	تو اُس کتاب کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک نہ کر، وہ بالکل ہی حق ہے، لیکن اکثر لوگوں کو ایمان نہیں اور اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا، جو خدا پر جھوٹ[1] باندھے۔ ایسے لوگ اپنے پروردگار کے روبرو پیش کیے جائیں گے اور گواہ کہیں گے کہ یہی وہ ہیں، جو اپنے پروردگار پر جھوٹ جوڑتے تھے۔ ہاں، ان ظالموں پر اللہ کی لعنت، جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس راہ کو وہ کج بنانا چاہتے ہیں اور وہ ہی آخرت کے منکر ہیں۔

[1] یعنی یہ کہے کہ خدا نے مجھ پر کتاب اُتاری، حالاں کہ خدا نے نہیں اُتاری، بلکہ خود گھڑ کر بنائی ہے، جیسا کہ مدیرِ "نگار" کا کافرانہ زعمِ باطل ہے۔

اس شخص سے بڑھ کر دروغ گو اور کون ہو سکتا ہے، جو یہ دعویٰ کرے کہ خدا نے فرشتہ کے ذریعہ مجھ پر کتاب نازل کی ہے، حالاں کہ وہ خود اس کی "ذاتی سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا نتیجہ ہے؟

اسی سورہ میں خاص قصصِ قرآنی کے سلسلہ میں، حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود)	یہ غیبی اطلاعوں میں سے ہے جن کو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں تو نہ تو خود ان کو اس سے پہلے جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ قصصِ قرآنی اُن غیبی اطلاعات میں سے ہیں، جن سے نہ صرف یہ کہ اس وحی سے پہلے آپ ہم کو واقفیت نہ تھی، بلکہ ساری قومِ عرب اُن سے ناواقف تھی۔ غیبی اطلاعات یہود و نصاریٰ کے مسموعات اور مسروقات نہیں۔ عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا۔ (اعراف۔۱۳)	ان آبادیوں کا کچھ تھوڑا حال ہم تم کو سناتے ہیں۔

یہ سُنانے والا اور بتانے والا کون ہے؟ کیا خود خدا نہیں؟

کیا اب بھی اس باطل نگار کے اس دعویٰ کو:

"اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے، جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں وہ مروجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی سے ادا کر دیتا ہے۔ . . .

قرآن مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور

نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں تورات و انجیل کے حوالہ سے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ تورات و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا' اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا' اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط"

سچائی کا کوئی ذرّہ نصیب ہو سکتا ہے؟

مشرکین کا تو دعویٰ ہی یہ تھا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں اور نہ اس کو فرشتہ لاتا ہے' بلکہ محمدؐ اپنے جی سے گھڑ کر اور پرانے قصوں (اساطیر الاولین) کو سن کر بنا لیتے ہیں اور جھوٹ خدا سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اب اگر یہی بات ایک نام کا مسلمان کہتا ہے' تو اس میں اور ابولہب اور ابوجہل وغیرہ میں فرق کیا ہے؟

قرآن مجید نے اُن کے اسی اعتراض کو افترا علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنا) کہہ کر ادا کیا ہے اور اس کی جا بجا تردید کی ہے۔ کفار کہتے تھے:

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (مومنون)	محمدؐ ایک ایسا شخص ہے' جو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے۔
أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (شوریٰ)	کیا یہ کافر کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے؟

اس کے جواب میں خدا فرماتا ہے: اے پیغمبرؐ!

قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي (ہود-۳)	کہہ دے! اگر میں نے اس قرآن کو خدا پر جھوٹ باندھا ہے' تو اس کا گناہ مجھ پر ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (احقاف)	کہ دے اگر میں نے اس قرآن کو خدا پر جھوٹ باندھا ہے تو تم اللہ کی طرف سے میرے واسطے مالک نہیں۔

سورۂ انعام میں ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (انعام - ۱۱)	اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور جو کہتا ہے کہ مجھ پر وحی بھیجی گئی حالاں کہ اس پر کوئی وحی نہیں آئی؟

کیا عجیب بات ہے کہ قرآن پاک تو اس افترا کی نفی کرتا ہے اور نام کا مسلمان اس کو رسول کے لیے ثابت کرنے کی جرأت کرتا ہے! کفار کے اس دعوٰی افتراء علی اللہ کے جواب میں بے شمار آیتیں ہیں، جن کا یہاں نقل کرنا بھی مشکل ہے۔

قرآن پاک میں لفظِ وحی آسمان و زمین اور بعض جانوروں اور دو غیر نبی انسانوں کی شان میں بھی آیا ہے، اس سے اس غلط نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"وحی کے لغوی معنی اشارۂ سریع یا الہام بالسرعۃ کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ فطری ودیعت ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی "خدا کی دین" اور نتیجہ ہے اُس ذہنی قوت کا، جو فطرۃً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چوں کہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف

نوعِ انسانی کی خدمت کے لیے ہوتا تھا، اس لیے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے مُنہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔" (جولائی صفحہ ۵۹)

کیا اِن سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ وہی ہے جو گذشتہ پرچہ میں بڑے عالمانہ ناز و تبختر سے اس کے قلم سے نکلا تھا؟ ذرا اس "عذرِ گناہ" کو اصل گناہ سے ملا کر دیکھیے کہ مسلمانوں کی گرفت سے گھبرا کر کہاں سے کہاں پہنچا ہے؟ اس کا اصل دعویٰ تو یہ تھا:

"کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہامِ ربانی، بلکہ انسان کا کلام جانتا ہوں۔ اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد وہ تاثرات ہوں گے، جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں وہ مروّجہ زبان میں نہایت کامیابی سے ادا کر دیتا ہے۔"

آپ نے دیکھا، پہلے اس نے وحی و الہام کے معنی انسانی تاثرات کے بتائے تھے اور اب ترقی کر کے قرآن پاک کی اُن آیتوں سے، جن میں وحی کا لفظ ایک خاص معنی میں استعمال ہوا ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وحی کے معنی "برمحل سوجھ بوجھ" کے ہیں، حالاں کہ ان دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ تاثرات غور و فکر کے بغیر واقعات کے انفعالی نتائج کا نام ہے، جو شاعر کے کام کی چیز ہے اور جس کی قرآن نے اپنے سے نفی کی ہے، مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، یعنی، قرآن شاعر کا کلام نہیں، یا یوں کہیے کہ تاثراتِ شاعرانہ کا نتیجہ نہیں اور "سوجھ بوجھ" انسانی غور و فکر کا ارادی نتیجہ ہے۔ اگر قرآن پاک سوجھ بوجھ اور انسانی غور و فکر کا ارادی نتیجہ ہوتا تو اس کی نسبت خدا کی طرف

کر کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کیا اُسی افتراء علی اللہ کے مرتکب نہیں ہوئے، جس کا الزام کفار آپؐ پر لگاتے تھے؟

بہرحال اپنے مضمون کی دوسری منزل میں مدعی نے یہاں تک تو ترقی کی کہ کسی نہ کسی معنی میں وہ قرآن پاک کو وحی والہام ماننے پر اُتر آیا اور جس کے قلم سے ایک مہینہ پہلے یہ نکلا تھا کہ

"کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی"

اس کے قلم سے ایک ہی مہینہ کے بعد یہ نکلا:

"اس لیے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا"

(جولائی ص۹۵)

اشارۂ خداوندی کے ماتحت جو چیز ہے کیا وہ غلط ہو سکتی ہے؟

آگے چلیے! اگست کے پرچہ میں کسی صاحب نے پوچھا کہ جب قرآن پاک انسانی کلام ہے تو اس کے دعوٰی اعجاز کے پھر کیا معنی ہوں گے؟ اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ) لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ کہا ہے، وہ ہوائی[1] باتیں نہیں (مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی) بلکہ وہ نتیجہ ہے اُس وحی یا اُس تائید غیبی کا، جو ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے" (ص۶۳)

---

[1] معارف:- عربی جاننے والے اس مدعی باطل کے فضل وکمال کا ماتم کریں۔

لیجیے، اب تو معاملہ یہاں تک آگیا کہ اُس نے جس کے قلم سے یہ نکلا تھا کہ میں قرآن کو الہامِ خداوندی نہیں سمجھتا، اُس نے "برمحل سوجھ بوجھ" سے ترقی کر کے وحی یا تائیدِ غیبی کی منزل تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ غیب کی تائید اور غیب کی قوت کیا چیز ہے؟ کیا خدا ہی کی تعبیر نہیں؟ معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ مولوی عبدالماجد صاحب کے جواب میں اسی مہینہ کے پرچہ میں صفحہ ۷۲ پر اس کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا:

"میں کہتا ہوں کہ خدا "نطق وکلام" کی اس صفت سے مبرّا ہے، جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا خدا کی توہین ہے اور یہ تصور وحدانیت کے سراسر منافی۔"

کاش اُس نے یہی کہا ہوتا، یہ کون نہیں کہتا کہ خدا نطق وکلام کی اُس صفت سے مبرّا ہے، جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو کلامِ خدا کہنا ان معنوں میں نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کلام کے ساتھ "نطق" کا لفظ اس منزل میں پہنچ کر کہاں سے شامل ہوگیا؟ نطق کا لفظ نواب تک کہیں نہیں آیا اور نہ اس کا کسی کو دعویٰ ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ رائے باطل بھی ہے:

"میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے" (صفحہ ۷۳)

"اشارۂ خداوندی" جب مسلّم ہے اور یہ کوئی موثر چیز بھی ہے، تو پھر رسول کے ذہن و دماغ کا کارنامہ کہاں رہا؟

مدّعی واقعی اگر رسول کی عظمت کے لیے بے چین ہے، تو رسول کی اس عظمت کے لیے وہ کیوں بے چین نہیں کہ اس کو اس دعویٰ میں کہ جو کچھ وہ پیش کرتا ہے، وہ

حرف حرف اللہ تعالٰے کا فرمودہ ہے، صادق اور راست باز یقین کرے اور اس کو اس کے اس دعوٰی میں مفتری و کاذب نہ ٹھہرائے؟

تاہم اس مقام پر اتنی ترقی اور ہوئی کہ گویا وہ شخص جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتا، اب یہ کہنے لگا کہ

"میں نے جون میں "آتش نمرود" پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ قرآن مجید اس معنی میں کلام ربانی نہیں ہے، جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں" (ص۶۵)

جون کے الفاظ اور اب اگست میں اس بیان کے الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے، کیا یہ ایک ہی شخص کے غیر متبدل عقیدہ کی تصریح ہے؟ بہرحال اس گت کے عقیدہ سے معلوم ہوا کہ ہمارا مدعی اب کسی نہ کسی نوع میں قرآن مجید کو کلام ربانی ماننے کے لیے آمادہ ہے:

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے!

اب ستمبر کا نمبر آتا ہے۔ اس میں کوئی طالب صفوی صاحب آتے ہیں، غنیمت ہے کہ "فہر زمانی" نہیں[1] اس مضمون میں ایک عجیب وغریب حدیث کا حوالہ ہے جس کا صحاح میں تو پتہ نہیں، بہرحال جو کچھ بھی کہا ہے، اس سے مدیر اپنا اتفاق ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

"وہ بعض متکلمین کی طرح قرآن کے مضمون و معانی کو اصل قرآن قرار دیتے ہیں اور الفاظ کو حادث سمجھ کر رسول اللہ سے منسوب کرتے ہیں بالکل یہی خیال میرا ہے" (صفحہ ۵۹)

---

[1] کہتے ہیں کہ پہلے "نقاد" آگرہ میں "مدیر" نگار اس شکل میں ظاہر ہوتے تھے۔

بہت مناسب! آگے وہ صاحبِ قلم جو قصصِ قرآنی کو یہود و نصاریٰ کی سُنی سُنائی باتوں سے ماخوذ بتا رہا تھا اب یہ کہتا ہے:

"اب رہا قصصِ قرآنی کا مسئلہ، سو میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا تعلق وحی و الہام سے نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کو تاریخی اہمیت نہیں دینی چاہیئے، بلکہ ان کی اس روایتی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جس کا تعلق درسِ اعتبار و بصیرت سے ہے" (اگست صفحہ ۹۵)

کیا ان سطروں کا لکھنے والا اپنے قول میں صادق ہے؟ کیا اس نے یہ نہیں لکھا تھا:

"کلامِ مجید کو نہ میں کلامِ خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہامِ ربانی، بلکہ انسان کا کلام جانتا ہوں ..... کلامِ مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا، ورنہ اُسے کلامِ مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہدِ نبوی میں اس قسم کی روایتیں تورات و انجیل کے حوالہ سے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ تورات و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لیے رسول اللہ (صلعم) نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا" (نگار ماہ جون)

جب مدعی کے نزدیک پہلے قرآن کا تعلق وحی و الہام سے نہیں تھا تو اس کے قصص کے حصہ کا بھی ظاہر ہے کہ وحی و الہام سے کیوں کر تعلق ہو سکتا ہے؟ کیا فاضل مدعی کا خیال اس تضادِ بیان کی طرف منتقل ہوا؟ آخر اس "عدمِ حافظہ" کی وجہ کیا؟

پھر اس نمبر میں اس سے چند صفحے آگے بڑھ کر صفحہ ۷۱ میں پروفیسر نواب علی صاحب کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

"میرے ان کے درمیان کلام اللہ کے عقیدہ میں بظاہر بہت کم اختلاف ہے۔ میں بھی قرآن مجید کو وحی و الہام کا نتیجہ سمجھتا ہوں لیکن صرف مطالب قرآنی کی حد تک اور ہرچند الفاظ قرآنی انسانی کلام ہیں لیکن چوں کہ وہ نتیجہ ہیں ایک "محض" "وجدان" کا اس لیے لفظی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند سمجھتا ہوں"

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جو قصص بیان کیے گئے ہیں وہ اسرائیلیات سے مختلف ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کو صحیح باور کرنے میں ہمیں عقل کو نظر انداز کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہی چیز ہمیشہ میری نگاہ میں کھٹکتی ہے۔

وہ شخص جو چند ماہ پہلے کلام مجید کو نہ کلام الٰہی مانتا تھا نہ الہام خداوندی، وہ یہاں تک تو خدا خدا کرکے پہنچا کہ معانی و مطالب کی حد تک وہ اس کو وحی و الہام کا نتیجہ سمجھنے لگا، ہرچند کہ الفاظ میں اس کو شک ہے۔

تاہم وہی قصص قرآنی جن کی نسبت اسی پرچہ میں (بھی) چند صفحے پہلے یہ کہہ چکا ہے:

"اب رہا قصص قرآنی کا مسئلہ سو میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا تعلق وحی والہام سے نہیں" (ص۶۹)

اب دو صفحوں کے بعد ان کی صحت اس کو کھٹکنے لگی۔

ثلہ معارف: کیا ہمارے محترم پروفیسر نواب علی صاحب کو بھی اس سے اتفاق ہے:

وکلٌّ یدعی وصلًا بلیلیٰ   ولیلیٰ لا تقرّ لھم بذاکا

اچھا تو کیا اب مدّعی یہ کہتا ہے کہ قصص قرآنی کا تعلق وحی و الہام سے ہے؟ اگر یہ کہتا ہے، تو پھر وحی و الہام کی باتوں میں اس کو شک کیوں ہے؟ اور پھر ان قصص کو یہود و نصاریٰ کے مسموعات سے ماخوذ دو ماہ پہلے کیوں بتا رہا تھا؟

بہر حال اب جب مدّعی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ قرآن پاک کو معانی و مطالب کی حد تک وحی و الہام سمجھتا ہے، تو کیا ان معانی و مطالب میں قصصِ قرآنی بھی داخل ہیں یا نہیں؟ اگر داخل ہیں، تو پھر وہ بھی وحی و الہام کی اطلاع کا نتیجہ ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا قرآن کا دعویٰ منزّل من اللہ ہونے کا مع اپنے الفاظ اور زبان کے ہے یا صرف معانی و مطالب کی حد تک؟ اس بارہ میں قرآن پاک کے یہ الفاظ غور کے قابل ہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (یوسف)	ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔
وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (رعد - ۵)	اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی زبان میں حکم بنا کر اُتارا۔
وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (طٰہٰ)	اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔
إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (زخرف)	بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا، تاکہ تم سمجھو۔
وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا	اور اسی طرح ہم نے عربی زبان میں قرآن

عَرَبِیًّا ۔ (شوریٰ) | تم پر اُتارا۔

ان تمام آیتوں پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو عربی زبان میں نازل فرمانے کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور کسی زبان میں کوئی چیز ہو نہیں سکتی جب تک اس کلام کے الفاظ خود اس زبان کے نہ ہوں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے تمام الفاظ بھی اللہ کی طرف سے وحی اور نازل ہیں۔ اس باب میں اب ایک آخری آیت پیش ہے، جو اس مسئلہ کے لیے قطعی فیصلہ کن ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (شعراء۔ ۱۱)	اور یہ قرآن پروردگار عالم کی طرف سے اُتارا گیا ہے۔ اس کو لے کر روح الامین تیرے دل کے اوپر اُترا ہے، تاکہ تو ہو ڈر سنانے والوں میں سے، بیان کرنے والی عربی زبان میں۔

(۱) سے معلوم ہوا کہ قرآن کو خدا نے اتارا ہے۔ روح الامین اس کو لے کر قلب نبوی پر اُترا اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں۔

یہ تو قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد تھا، لیکن چوں کہ ہمارے عامی کو "عقل" بہت پسند ہے اور اسی سے مذہبیات میں بہت ڈرتا ہے، اس لیے یہ سوال دلچسپ ہوگا کہ کیا اس نے یہ غور کیا ہے کہ مرتبہ علمیہ یا کلام فی النفس کے علاوہ جس کو کلام نفسی کہتے ہیں، معانی و مطالب جب ذہن انسانی میں خطور کریں گے تو کیا وہ الفاظ کے لباس کے بغیر عریاں خیال میں بھی آسکتے ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ جس طرح مادیات شکل و صورت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتے، اسی طرح معنویات الفاظ کے پردہ کے بغیر خطور نہیں کر سکتے؟

یاد ہوگا کہ مدّعی نے یہ سارا جھگڑا اس لیے مول لیا تھا کہ کسی صالح حسین مراد آبادی نے جو غالباً فرضی نام ہے، حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں جلائے جانے کے قصّہ کی نسبت یہ سوال کیا تھا کہ جب یہ قصّہ قرآن پاک میں ہے، تو ہم کو اس کی واقعیت پر یقین لانا چاہیے، اس کے جواب میں مدّعی نے یہ کہا کہ قرآن پاک نہ کلامِ الٰہی ہے، نہ الہامِ ربّانی اور نہ اس قصّہ کے درج قرآن ہونے سے اس کی صداقت لازم آتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ نے توریت و انجیل کے قصّوں کو سُن کر اور ان کو الہامی جان کر درج کر دیا ہے۔

اب جب کہ مدّعی معانی و مطالب کی حد تک قرآن پاک کو وحی و الہام مان چکا ہے، تو یہ قصّہ بھی جن لفظوں میں قرآن پاک میں ہے، وہ مطلب و معنی ہی کی حد تک سہی، الہامی ٹھہرا اور جب الہامی ہوا، تو پھر اس کی تصدیق سے اب کیوں کر چارہ ہے؟ کیوں کہ ظاہر ہے کہ واقعیت و عدم واقعیت کا تعلق مطالب و معانی سے ہے، نہ کہ الفاظ و عبارات سے تو جب قرآن پاک مطالب و معانی کی حد تک وحی و الہام اور قوّتِ غیبی کا نتیجہ ہوا، تو اب اس منزل میں اس مہینہ پہنچ کر قرآن پاک کا ہر واقعہ مطلب و معنی کی حد تک یقینی، قطعی، ریب و شک سے بالاتر اور اس کا ذریعۂ علم وحی الٰہی، تنزیل ربّانی، فرمودۂ خداوندی، انسانی سوجھ بوجھ سے بری اور مسموعات انسانی سے پاک و منزہ قرار پا گیا یا نہیں؟ اور اگر نہیں، تو مدّعی کتنی ہی تاویلوں کے پردے ڈالے، وہ اب بھی ایمان بالقرآن سے محروم ہے۔

لہ اور اگر حقیقت میں مراد آباد میں کوئی صاحب اس نام کے ہیں، جنھوں نے مدیر نگار سے یہ سوال کیا تھا، تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے نام و نشان کو ظاہر کریں۔

مدعی نے ستمبر میں لکھا ہے کہ چند علماء اُن کی تائید میں ہیں، جو الفاظ قرآنی کو محمد رسول اللہ صلعم کی تالیف بتاتے ہیں۔ کیا مہربانی کرکے اُن علماء کی تصنیفات کے حوالوں سے مطلع کیا جائے گا؟ وہ بھی صالح حسین مرادآبادی کی طرح کی ہستیاں تو نہیں ہیں؟

بہرحال اب ہماری درخواست ہے کہ مدعی جس منزل تک اس مہینہ میں پہنچ چکا ہے، اب آئندہ اس میں آگے کو اپنی ترقی وہ جاری رکھے یا نہیں، مگر خدا کے لیے وہ اب پیچھے نہ ہٹے اور وہیں نہ پہنچ جائے، جہاں وہ جون ۱۹۴۳ء میں تھا۔

وحی کے اقسام

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ یہ مدعی دلائل کی گرفت سے گھبرا کر جس منزل پر آکر رُکا ہے، کیا یہاں بھی اُس کے لیے پاؤں ٹیکنے کی جگہ ہے؟ اوپر بتایا گیا ہے کہ مدعی کی غلطی کا منشا جیسا کہ وہ ظاہر کرتا ہے، وہ آیتیں ہیں، جن میں حیوانوں اور عام انسانوں، بلکہ شیطانوں تک سے وحی کی نسبت کی گئی ہے۔ اب ہم ان میں سے ایک ایک قسم کی آیت لے کر اس پر بحث کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟

وحی ربّانی کی حقیقت سب سے پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ وحی ربّانی کے یعنی، اُس وحی کے جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے، معنی کیا ہیں؟ سو معلوم ہونا چاہیے کہ وحی ربّانی اس طریقۂ غیبی یا ذریعۂ غیبی کا نام ہے، جس کے واسطہ سے انسان کے غور و فکر، کسب و نظر اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص

اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض اس کے فضل و عطا سے کوئی علم آتا ہے اور آیاتِ قرآنی اس پر گواہ ہیں۔ ہم یہاں ان ہی آیتوں کو پیش کرتے ہیں، جن میں قصصِ قرآنی کی نسبت سے وحی کا ذکر ہے۔

حضرت مریمؑ کے قصّہ کے بعد ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ (آل عمران ۵)	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے قصّہ کے بعد ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ (ہود - ۴)	یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں، ہم ان کو تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ نہ تجھ کو اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے ان کا علم تھا۔

حضرت یوسفؑ کے قصّہ کے بعد ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ (یوسف - ۱۱)	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، ہم تیری طرف اس کو وحی کرتے ہیں۔

وحی کی حقیقت کی جو تشریح مدّعی نے اب تک کی ہے، وہ یہ ہے "برمحل سوجھ بوجھ، نفسانی تاثر اور وجدان"۔ ہر شخص سے جس میں عقل کا کوئی ذرّہ ہے، یہ سوال ہے کہ دنیا کے تاریخی واقعات کا علم کسی شخص میں برمحل سوجھ بوجھ، نفسانی تاثر اور وجدان سے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو جب ہی معلوم ہو سکتے ہیں کہ یا تو وہ کسی سے سُنے جائیں یا کسی کتاب میں پڑھے جائیں۔ قرآن پاک نے ان دونوں طریقوں کی نفی کر دی ہے اور یہاں پر ظاہر بھی کر دیا ہے کہ ان تمام واقعات کا علم انسانی ذرائع سے نہیں، بلکہ غیب سے بہ ذریعۂ وحی ہوا ہے۔

انسانی ذریعۂ علم کے ان دونوں طریقوں کی نفی قرآن پاک کی حسب ذیل آیت میں ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (عنکبوت - ۵)

اس (دعوٰی نبوت یا نزولِ قرآن) سے پہلے نہ تو تُو کوئی کتاب ہی پڑھتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش بھی نکلتی۔

اب رہا یہود و نصارٰی سے سُن کر ان واقعات کا علم، تو دوست دشمن سب کو معلوم ہے کہ مکّہ کی زندگی میں یہود و نصارٰی سے آپ کی صحبت کسی طرح ثابت نہیں اور نہ مکّہ معظمہ میں اُن کی آبادی تھی۔ لے دے کر ایک بحیرا راہب کا افسانہ عیسائیوں کے پاس ہے، جس سے جیسا کہ کہا جاتا ہے، سفرِ شام میں اپنے چچا کے ساتھ آپ کی ملاقات چند منٹ کے لیے ہوئی تھی اور جس نے آپ کو دیکھ کر آپ م کے چچا کو بھتیجے کی پیغمبری کی خوش خبری سُنائی تھی۔ اگر دس بارہ برس کا یہ بچّہ ان چند لمحوں کی ملاقات میں ایک شخص سے وُہ سب کچھ سُن سکا اور اُن کو سمجھ سکا، جو قرآن پاک کی دَو دفتیوں کے درمیان ہے، تو یہ مافوق بشری طاقت بجائے خود آپ م کی نبوّت کی دلیل ہے۔

بہرحال اب عیسائی مناظرین سے معلومات حاصل کر کے، مسلمان نیاز بتائیں کہ آں حضرت صلعم نے کن یہودیوں اور عیسائیوں سے کہاں اور کب قصصِ قرآنی کے یہ معلومات حاصل کیے؟ (نعوذ باللہ تعالیٰ)

وحی کے معنی کی تعیین کے بعد جو کہ غیبی تعلیم کا نام ہے، آئیے وحی کے بعض

اقسام پر غور کریں!

مدّعی نے قرآن پاک کی ان اکثر آیتوں کو یک جا کر کے جن میں وحی کا لفظ ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "وحی کے معنی ہیں "برمحل سوجھ بوجھ" اور یہ نتیجہ ہے اُس ذہنی قوت کا جو فطرۃً انسان میں ودیعت رکھی گئی ہے" (جولائی صفحہ ۵۹)۔

اب آیئے دیکھیں کہ وحی کے یہ معنی کہاں کہاں صادق آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مدّعی نے یہ خوب لکھا ہے:

"سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعیّن کرنے میں روا رکھی گئی ہے، یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رُسل کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے، حالاں کہ یہ حقیقت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے" (جولائی صفحہ ۶۰)

اے کاش یہ معلوم ہوتا کہ یہ غلطی کس نے روا رکھی ہے؟ کیا علمائے اسلام میں سے کسی نے یہ کہا ہے کہ وحی بہ معنی عام صرف انبیاء علیہم السّلام کے لیے مخصوص ہے جس اختصاص کا ان کو دعویٰ ہے، وہ اس قسم کی وحی کے متعلق ہے، جو صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے مخصوص ہے۔

قرآن پاک کی آیتوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ از روئے قرآن وحی کی تین قسمیں ہیں: وحی نوعی یا فطری، وحی شخصی یا جزئی اور وحی نبوی، اور تینوں کے الگ صفات اور لوازم ہیں۔ سب سے پہلے وحی نوعی یا فطری کو لیجیے، جس سے مدّعی کو سب سے زیادہ مغالطہ پیش آیا ہے یا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔

وحی نوعی یا فطری یہ وُہ وحی ہے، جو آسمان و زمین اور جانور اور جمادات بلکہ ہر نوعِ مخلوق کو ملی ہے اور جس کو اہلِ علم کی اصطلاح میں جبلّت یا بعض لوگ

تسامح کر کے فطرت کے احکام نوعی کہہ دیتے ہیں۔ اس وحی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس نوع کے تمام افراد کو یکساں ملتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ پرندوں کے بچوں کا اُڑنا، آبی جانوروں کا تیرنا، جانوروں کا چرنا اور چگنا، انسان کے بچوں کا دودھ پینا، بلی کے بچوں کا شکار کرنا، شہد کی مکھیوں کا پھولوں اور پھلوں کا رس چوسنا اور اونچے اونچے درختوں اور پہاڑوں میں چھتے بنانا اور شہد پیدا کرنا۔ یہ سب ان کے احکام نوعی کا اقتضاء ہے، جو اول پیدائش ہی میں خدا نے ان کی طبیعتوں میں وحی کر دیا جس کے ماننے پر وہ مجبور ہیں اور جو عجائب قدرت میں ہیں اور جن کو دیکھ کر عادی ہو جانے کی بناء پر آپ ان کو احکام فطرت کہتے ہیں اور شوق سے کہیے، مگر یہ سمجھیے کہ احکام فطرت خود نہیں پیدا ہوئے ہیں، بلکہ خالق فطرت کے وہ وحی و احکام ہیں، جو ان کی نوع کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے ان کو دے دیے گئے ہیں۔

اس معنی کو پیش نظر رکھ کر اس آیت کو پڑھیے، جو ہمارے مدعی کے لیے غلطی کا سرچشمہ بن گئی ہے:

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○

(نحل)

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ تو پہاڑوں، درختوں اور چھتوں میں اپنے لیے گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے میووں سے کھا، سو اپنے پروردگار کے (مقررہ) رستوں میں اطاعت گزار ہو کر چل۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز مختلف رنگوں کی جس میں انسانوں کے لیے شفا نکلتی ہے۔ اس واقعہ میں سوچنے والوں کے لیے (اللہ کی) نشانی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فطری حکم کو وحی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے جس کی اطاعت شہد کی مکھی کے ہر فرد پر واجب ہے۔ یہ شہد کی مکھی پر حکم نوعی ہے، جس کو خدا نے آغازِ خلقت ہی میں اُس پر واجب ٹھیرا دیا ہے، جس سے نافرمانی شہد کی مکھیوں کے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ علم شہد کی مکھی کو "برمحل سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" یا غور و فکر اور تجربہ و استدلال سے حاصل نہیں ہوا ہے۔

انسانوں میں پیدائش کے آغاز ہی میں نیکی و بدی، خیر و شر، فجور اور تقویٰ دونوں کی صلاحیتیں خالقِ فطرت کی طرف سے ودیعت رکھ دی گئی ہیں اور یہ وہ حکم ہے، جو اوّل روز ان کو ہو چکا، اس لیے خدا نے اس کو اپنا الہام فرمایا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس)	پھر ہر ایک کے جی میں ڈال دی اُس کی بدکاری اور اُس کی پرہیزگاری۔

دیکھیے کہ انسان کے اس حصولِ استعداد میں "برمحل سوجھ بوجھ" اور غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو کوئی دخل نہیں!

آگے چلیے! اللہ تعالیٰ کی یہ وحی بے جانوں کو بھی پہنچی ہے۔ زمین کی وحی ہے کہ اُس کی پیٹھ پر قیامت تک جو کچھ ہوگا، وہ اپنی زبانِ قال یا زبانِ حال سے اُس کا سارا افسانہ ایک دن دُہرا دے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (زلزال)	اُس دن اپنا سب احوال بتائے گی کیوں کہ اُس کے پروردگار نے اس کو وحی کر دیا۔

بے وقوف بھی جانتا ہے کہ یہ شہادت زمین کی "برمحل سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" غور و فکر اور نظر و استدلال کا نتیجہ نہ ہوگی۔

آسمان کو بھی وحی ہوئی کہ وہ اپنے کاروبار کو اس طرح انجام دیتا رہے، جس طرح خدا نے اس کو حکم دیا ہے۔ آفتاب اسی طرح ڈوبتا اور نکلتا رہے، چاند اسی طرح چمکتا اور چھپتا رہے اور ستارے اسی طرح چلتے رہیں، جس طرح خدا نے آغازِ خلقت میں اُن کو حکم دے دیا ہے۔ فرمایا:

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ط (فُصِّلَت-۲)	اور خدا نے ہر آسمان میں اُس کے کام کو وحی کر دیا۔

اب اسی حکم ازلی کے مطابق ہر آسمان اپنے کام کو انجام دے رہا ہے۔ اس میں آسمان کے "برمحل سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" غور و فکر اور تجربہ واستدلال کا کوئی محل نہیں۔

وحی شخصی یا جزئی وحی کی دوسری قسم وُہ ہے، جو خواص اُمّت کو اور وُہ بھی ازروئے قرآن انبیاء علیہم السّلام ہی کے سلسلہ میں ملی ہے اور اس کا دوسرا اصطلاحی نام القاء، الہام (اصطلاحی معنوں میں) اور محدّثیت اور مکلّمیت ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی ماں کو وحی ہوئی کہ بچّہ کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دو اور تم بہ اطمینان رہو۔ دشمن اُس کو ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور ایک دن میں اُس کو پیغمبر بناؤں گا۔ فرمایا:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٥ (قصص-۱)	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اس بچّہ کو دودھ پلائے جا۔ پھر جب تجھ کو اس بچّہ پر ڈر لگے، تو اس کو تو دریا میں ڈال دے اور خوف نہ کھا، غم نہ کر، ہم اس کو پھر تیری طرف لوٹا کر لے آئیں گے

اور ہم اُس کو پیغمبر بنانے والے ہیں۔

ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ یہاں حضرت موسیٰ ؑ کی ماں کی وحی اُن کی "برمحل سوجھ بوجھ" تھی، لیکن کیا "برمحل سوجھ بوجھ" سے یہ بھی اپنے بچّے کے متعلق اُن کو معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ لڑکا دریا میں ڈوب نہیں جائے گا اور پھر میرے پاس آجائے گا اور ایک دن پیغمبر ہوگا؟ یہ غیب کی خبر تو غیب کی اطلاع ہی سے معلوم ہو سکتی تھی، اس لیے یہ "برمحل سوجھ بوجھ" یا "نفسانی تاثرات" یہاں بھی وحی کا ترجمان نہیں۔ یہاں مقصود وحی کی وُہ قسم ہے، جس کو اصطلاح میں الہام کہتے ہیں، خواہ وہ رویائے حق کے ذریعہ سے ہو، یا بیداری میں القاء فی القلب کی صورت میں ہو یا اور کوئی شکل ہو۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیروی کا الہام حواریوں کو ہوُا۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۔

(مائدہ۔ ۱۵)

اور جب میں نے حواریوں کی جانب وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ۔ اُنھوں نے کہا ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مُسلم و فرماں بردار ہیں۔

یہاں بھی اسی شخصی وحی کا ذکر ہے، جو الہام و القاء یا رویائے حق کی شکل میں حواریوں کو ملی۔ حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ رویائے حقّہ نبوّت کے بہت سے اجزاء میں سے ایک جز ہے، جو ایک مرد مومن کو عطا ہوتا ہے۔ یہ بھی آتا ہے کہ منصبِ نبوّت کے بغیر کچھ خواصِ اُمت ہیں، جو بعض معاملات کے متعلق غیب سے خبر پاتے ہیں؛ یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء۔

غرض رویائے حقہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ شرح صدر بھی اس کا ایک کارنامہ ہے اور اس کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ ملائکہ کا تمثل اس کے سامنے ہوتا ہے اور منادی غیب کی آواز اس کو سنائی دیتی ہے؛ جیسا کہ حضرت مریمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور بعض دوسرے انبیاء علیہم السلام کی بیویوں کے تذکروں میں قرآن میں ہے، مگر قرآن پاک میں اس وحی کا ذکر صرف انبیاء کے تعلق سے ہے، یعنی اُن کی خاطر یہ اطلاع دوسروں کو دی گئی۔ اس لیے اس کا تعلق کسی خاص جزئی واقعہ سے ہے، نہ کہ عموم تبلیغ اُمت سے اور اسی لیے ہم نے اس کا نام وحی شخصی اور وحی جزئی رکھا ہے۔

مگر آپ پھر بھی یہ دیکھ لیں کہ "برمحل سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا یہاں بھی کوسوں پتہ نہیں۔

وحی نبوی اب آیئے! اس وحی نبوی پر غور کریں، جو کتاب الٰہی کی تنزیل کا ذریعہ ہے کہ اس کی نسبت قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ ہر چند کہ یہ بحث پہلے نمبر میں گذر چکی ہے، مگر اقتضائے مقام کی وجہ سے اس کا اعادہ موزوں ہے۔ قرآن پاک نے وحی نبوی اور کلام الٰہی کے اقسام کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (شوریٰ-۶)	اور کسی بشر کی تاب نہیں کہ اللہ اُس سے دُو بہ دُو کلام کرے، لیکن یہ کہ وہ الہام کرے یا پردہ کے پیچھے سے بات کرے یا کوئی قاصد بھیجے، جو اللہ کے حکم سے اللہ جو چاہتا ہے اس کا پیغام اس کو پہنچا دے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کلام اللہ پاک نے ان میں سے اپنے نزول اور

وحی کی صورت کیا بتائی ہے؟ چنانچہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ - (بقرہ ع ۱۲)

کہدے کہ جو جبریل کا دشمن ہے (تو وہ ہو اس سے قرآن کی صداقت پر حرف نہیں آتا) کیوں کہ اس نے (اے محمدؐ!) تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس قرآن کو اتارا ہے

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (شعراء ۱۱)

یہ قرآن سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے اس کو روح الامین فرشتہ لے کر تیرے قلب پر اترا۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ - (نحل)

(اے رسولؐ! ان کے جواب میں) کہہ! روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اس کو اتارا ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ (نجم)

یہ رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ وہ تو وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے اس کو بڑی قوت والے نے سکھایا۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ

بے شک یہ قرآن ایک بزرگ پیغام رساں کا بولا ہوا ہے۔ وہ کسی شاعر کا بولا ہوا نہیں تم کم ایمان رکھتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا بولا ہے تم کم نصیحت پکڑتے ہو۔ پروردگار عالم کا اتارا ہے اور اگر یہ رسول ہم پر یعنی خدا پر کچھ باتیں اپنی طرف سے بنا کر گھڑتے

لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ (حاقہ)	تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں پھر اس کی رگِ گردن کو کاٹ دیں۔ پھر تم میں سے کوئی اس کو بچا نہ سکے۔

ان آیتوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے باطل خیال لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو پیغمبر کے سامنے بھی گندرے ہیں۔ جو قرآن پاک کے "نفسانی تاثرات" اور "سوجھ بوجھ" کے ہونے کے قائل تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ شاعر کا کلام نہیں کیوں کہ وہ سراسر نفسانی تاثرات کا نتیجہ ہوتا ہے اور نہ کسی سیانے کاہن کا کلام ہے، جو خوب سمجھ بوجھ کر اپنے کلام کو جوڑ توڑ کر سناتا ہے بلکہ ایک بزرگ پیغام رسان کی زبان سے ادا ہوا اور جو پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ ساتھ ہی یہ دھمکی ہے کہ اگر یہ رسول اپنے نفسانی تاثر اور ذاتی سمجھ بوجھ سے کچھ کلام گھڑے تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیں اور اس کو وہ سزا دیں کہ کوئی اس کو بچا نہ سکے۔

اللہ اکبر! جس کلام کی یہ شان ہے، وہ ایک مدعی اسلام کی نظر میں محمد (صلعم) کا نفسانی تاثر اور انسانی سوجھ بوجھ قرار پائے۔ العیاذ باللہ!

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ	بے شبہ یہ ایک بزرگ پیغام رسان کا کلام ہے، جو قوت والا ہے۔ عرش والے خدا کے یہاں ذی مرتبہ ہے اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں وہ امانت دار ہے۔ تمہارا یہ رفیق (یعنی رسول اللہ صلعم) دیوانہ نہیں اس نے اس پیغام رسان کو آسمان کے

تَرَجِیْمٍ ۝ (تکویر) کھلے کنارے پر دیکھا، وہ غیب کی باتوں کو (جو اس کو بتائی جاتی ہیں) چھپاتا نہیں اور نہ یہ شیطان راندے گئے کا کلام ہے۔

اس سے زیادہ تصریح کیا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کے دل میں اس کو ڈالا اور جبریلؑ نے محمد رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک پر نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ نہ یہ وحی فطری اور نوعی ہے، ورنہ شہد کی مکھیوں کی طرح نوع انسانی کے تمام افراد اس میں شریک ہوتے، نہ وحی شخصی ہے، ورنہ تمام انسانوں کے لیے قابل عمل نہ ہوتی، بلکہ وحی نبوی ہے، جو روح القدس کے ذریعے نبیؑ پر اتری، اور ان کے واسطے سے سب پر واجب العمل ٹھیری۔

وحی شیطانی اب ایک چیز وحی شیطانی رہ گئی ہے، جس کا [illegible] مدعی کے سوا کوئی اور قائل نہیں۔ قرآن پاک میں بہ طور طنز بے شبہ اس کا ذکر آیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (انعام ۱۱۲)	اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے واسطے کچھ دشمن بنائے، انسانوں اور جنوں کے شیطان۔ ان میں سے بعض بعض کے اندر ملمع کی ہوئی بات فریب دینے کے لیے

وحی کرتے ہیں۔

آگے چل کر پھر اسی سورہ میں ہے:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰۗـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ	اور شیطان لوگ البتہ وحی کرتے ہیں اپنے دوستوں کی طرف تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کا کہا [illegible]

لَمُشْرِكُوْنَ ۝ (انعام-۱۴) | تو بے شک تم بھی مشرک ہو۔

جس کو کسی زبان کے ادب کا ذرا بھی ذوقِ سلیم ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہاں وحی کا لفظ وسوسۂ شیطانی کے لیے بہ طور طنز کے آیا ہے، اس قسم کے محاورے ہر زبان میں ہیں۔ "ذاتِ شریف" سے کون واقف نہیں؟ لفظ کتنا خوب صورت اور معنی کتنے کریہہ ہیں۔ غرض اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کی نسبت قرآن نے شیطان کی طرف کی ہے۔ قرآن نے کئی جگہ یہ کہا ہے:

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (آل عمران، توبہ، انشقاق) | ان کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے۔

عذاب کی خوش خبری کیا شیطان کی وحی سے زیادہ عجیب نہیں؟ قرآن میں کافر دوزخی کو خطاب ہے کہ اس کو عذاب کے وقت کہا جائے گا:

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ (دخان) | اس کا مزا چکھ تو تو بڑا غالب اور عزت والا ہے۔

ایک دوزخی کو معزز و محترم و غالب کا خطاب ظاہر ہے کہ محض طعن و تقریع کے لیے ہے، کیوں کہ وہ دنیا میں اپنے کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔

بہ ہر حال اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے لیے وسوسہ کے بجائے وحی کا لفظ بولنا محض طعن و توبیخ و تقریع کے لیے ہے، نہ کہ واقعہ!

قرآن انسان کی فطری قوت کا نتیجہ نہیں

اب ایک ایسی آیت پیش کی جاتی ہے، جس سے یہ ثابت ہوگا کہ قرآن پاک کسی ودیعت شدہ فطری انسانی قوت کا نتیجہ نہیں، بلکہ غیب کی طرف سے وقتاً فوقتاً آئے ہوئے سچے خدائی پیغاموں کا نام ہے۔ ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ - ٦)	اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن کرکے اُتارا اور اس میں طرح طرح کے ڈر کی باتیں بیان کیں، تاکہ وہ پرہیزگار ہوں یا ان کے لیے یاد پیدا کرے، تو بلند رتبہ ہے وہ بادشاہ برحق اور جلدی مت کر قرآن میں اس سے پہلے کہ اس کی وحی تیری طرف پوری کر دی جایا کرے اور کہہ اے میرے پروردگار! اور زیادہ دے مجھ کو علم۔

لفظ " قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا " یہاں بھی اور دوسری آیتوں میں بھی حال ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی عربیت خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے الفاظ بھی خدا نے پاک کے ہیں۔

دوسری بات جو اس موقع کے مطابق ہے، یہ ہے کہ اس آیت میں رسول ؐ کو یہ حکم ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جلدی نہ کیجیے، جب تک اس کی وحی پوری نہ کر دی جایا کرے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی وحی وُہ وحی فطری نہیں، جو طبیعتِ انسانی میں ودیعت دائمی ہوتی ہے، بلکہ وہ وحی نبوی ہے، جو وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے آتی رہی۔

کلامی مباحث | باقی مدّعی نے جو کلامی مباحث چھیڑے ہیں اور جن خطرناک علمی خدشوں میں وہ گرفتار رہے، اُن کا جواب اپنے اپنے اصول پر " البیان " امرتسر نے مختصراً اور " الفرقان " بریلی نے مفصّل دے دیا ہے، جو امید ہے کہ تشفی بخش

ثابت ہوگا، اس سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ قرآن کی نسبت قولی خدا کی طرف، رسول کی طرف اور عام انسانوں کی طرف کن کن معنوں میں ہوتی ہے۔

جعلی کاغذی سکہ | مُدیر "نگار" کی خدمت میں آخری گذارش یہ ہے کہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ علم بہت کچھ پھیل چکا ہے۔ ان کو تجربہ ہو چکا ہے کہ کاغذ کا جعلی سکہ بنانا آسان مگر اُس کا چلانا بہت مشکل ہے۔ اس تجربہ سے ان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ والسلام (معارف)

تردید ارتداد

(جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی اے)

(۱)

"چوں کہ میں رسول اللہ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، اس لیے قرآن میں واقعۂ ابراہیمؑ کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے اسے جھوٹ نہیں بیان کیا، یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں بیان کیا، لیکن اس کا اثر نفس واقعہ کی صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔ کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی، کہ وہ صحیح ہیں یا غلط" (نگار جون ۱۹۴۰ء ص۹)

گویا قرآن مجید ہرگز ایسی کتاب نہیں جس کا لفظ لفظ، حرف حرف الہامی ہو، بلکہ ایسی بھی نہیں جیسے نیاز فتحپوری جیسے محقق انسان کے مرتب کیے ہوئے مستند و معتبر تاریخی مضامین ہوتے ہیں، بلکہ اس کے قصص و حکایات بس اُسی درجہ کا استناد رکھتے ہیں، جیسے چھوٹے بچوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے جاہل مائیں اور انائیں، بھوت پریت، دیو، پری کی کہانیاں سُناتی رہتی ہیں؟ اور رسول اللہ باوجود ایک بلند اخلاق اور سچے انسان ہونے کے (خاکم بدہن) اتنا بڑا تاریخی اور بے مثال جھوٹ بول گئے کہ سارے قرآن کو اپنی طرف سے گڑھ کے اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کر دیا! ——— گویا رسول ؐ سے متعلق لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف وہی تشخیص، جو سردارانِ جاہلیت، ابوجہل و ابولہب لے کی تھی کہ محمدؐ ہیں تو صادق و امین، لیکن (نعوذ باللہ) افتراء علی اللہ میں حد درجہ دلیر و بےباک"! ——— یہ معنی ہیں ابوجہل کے نئے بردارکے بیسویں صدی عیسوی میں (''صدق'' جلد ۶ نمبر ۸ صلا)

(۲)

"کلام کا مفہوم اُس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا، جب تک نطق اس سے متعلق نہ ہو اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا، اس لیے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق بھی لازم ہوگا، جس کا تعلق یک سر مادیات سے ہے" (''نگار'' ماہ جون ۱۹ء)

اس لیے:

"کلام مجید کو میں نہ کلامِ خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہامِ ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں"

نتیجہ کو چھوڑیے، صرف استدلال کو لیجیے دلیل یہ ہے کہ چوں کہ نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا، اس لیے خدا کو متکلم فرض کرنے سے اس کے عضلات مادی کا وجود اور اس لیے خود اس کا مادی ہونا لازم آتا ہے۔ بہت خوب! لیکن اس منطق کو یہیں تک کیوں محدود رکھیے، کیوں نہ یہ کہیے کہ بصارت چوں کہ نام ہے آنکھ کے مخصوص عضلات کی حرکت کا اور سماعت چوں کہ نام ہے کان کے پردوں اور عضلات کے تاثر کا، اس لیے خدا کو نہ بصیر کہہ سکتے ہیں نہ سمیع، اور چوں کہ ارادہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کے نظامِ عصبی کی فعلیت کا، اس لیے خدا کو صاحبِ ارادہ کہنا، اس کا صاحبِ اعصاب، صاحبِ دماغ وغیرہ ہونا تسلیم کرنا ہے اور پھر چوں کہ زندگی نام ہے سانس کی آمد و شد کا اور قلب کی حرکت کا، اس لیے خدا کو زندہ کہنا اس کے لیے شرائین خون اور آلاتِ تنفس وغیرہ کا تسلیم کرنا ہے اور اس طرح جتنی بھی صفاتِ جمالیہ و کمالیہ آج تک اللہ تعالیٰ کے متعلق تسلیم کی گئی ہیں، سب سے ایک ایک کر کے انکار اسی طرح کیا جا سکتا ہے اور پھر تمام اعراض و صفات سے معرّٰی محض ہو کر نفس وجود ہی کب ثابت رہ سکتا ہے؟ ——— صاحبِ "نگار" کا یہ احسان کچھ کم ہے کہ انکار ابھی تک صرف صفتِ کلام سے کیا گیا ہے! ("صدق" جلد ۶ نمبر ۹ صفحہ ۲)

(۳)

"الہام خداوندی کو کسی ایک یا ایک سے زائد مخصوص زبانوں میں محدود کر دینا، خدا کی صفت کو محدود کر دینا ہے اور چوں کہ صفاتِ ربّانی عین ذاتِ ربّانی ہیں، اس لیے اس طرح گویا خدا کو محدود کر دینا ہوگا، جو عقیدۂ اسلام کے بالکل منافی ہے" ("نگار" ماہ جون صفحہ ۶۸)

نکالا ہوا نتیجہ "عقیدۂ اسلام کے بالکل منافی" ہو یا نہ ہو ——— کیا "نگار" کے خیال میں یہی معیار حقانیت عقیدۂ اسلام سے مطابق ہے؟ ——— مقدماتِ دلیل خود تعلیماتِ عقل کے کب مطابق ہیں؟ چوں کہ خدا نے پیغمبر فلاں اور فلاں حضرات کو بنا کر بھیجا' اس لیے وہ ساری خلقتِ انسانی کو پیمبر بنانے پر قادر نہیں! چوں کہ ایمان والے ہر زمانہ میں صرف ایک محدود تعداد میں رہا کیے ہیں' اس لیے خدا سب کو راہِ ہدایت دکھانے پر قادر نہیں! چوں کہ خدا نے دن ہی کو روشن بنایا ہے' اس لیے وہ رات کو روشن بنانے پر قادر نہیں! چوں کہ ابر ہی سے وہ بارش لاتا ہے' اس لیے بغیر ابر بارش پیدا کرنے پر قدرت ہی اُسے حاصل نہیں! غرض اُس کی قوت و قدرت پر تحدید تو قدم قدم پر ہے ——— یہ نتائج دنیا میں آج تک کسی بڑے سے بڑے جاہل نے بھی نکالے ہیں؟ ("صدق" جلد ۶ نمبر ۹ صفحہ ۳)

(۴)

"اس امر کا ثبوت کہ وحی کا تعلق کسی مخصوص زبان سے نہیں ہے' خود کلام مجید سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: فاوحیٰ ربك الی النحل۔ ظاہر ہے کہ شہد کی مکھی پر عربی و عبرانی میں تو وحی نازل ہوئی نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے مراد مکھی کی وہ فہم و ذکاوت ہوگی جس کے زیرِ اثر وہ پھولوں کا رس جا کر چوستی ہے۔ کلام مجید کو بھی وحی کہتے ہیں' اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی رسولؐ کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے" ("نگار" بابت ماہ جون ۲۹ء)

بے علم کی منطق آپ نے دیکھ لی؟ چوں کہ قرآن مجید میں لفظ وحی کا ایک موقع استعمال

شہد کی مکھیوں کے سلسلہ میں ہے' اس لیے اب جہاں جہاں اور جس سلسلہ، جس سیاق میں بھی یہ لفظ آئے گا' اس کے معنی وہی قائم رہیں گے۔ گویا ایک لفظ کے نئے نئے معنی و مفہوم نہ قرآن میں آتے ہیں نہ لغت عرب میں' نہ اُردو' انگریزی' فارسی زبان کے ادب میں! قرآن کی تفسیر و ترجمانی کا حق ایسے محقق کو نہ حاصل ہوگا تو اور کس کو ہوگا؟ (''صدق'' جلد ۶ نمبر ۹ صفحہ ۳)

(۵)

''کلام مجید میں تقریباً وہی بیان کیا گیا ہے' جو یہودیوں کی کتاب مرداش ربا میں پایا جاتا ہے۔ پہلے آپ اسلامی روایت مختصراً سن لیجیے ۔ ۔ ۔ اب یہودیوں کی کتاب مرداش ربا کو سنیے ۔ ۔ ۔ مرداش ربا کی اس روایت اور اسلامی روایت کا پیش منظر بالکل ایک ہے ۔ ۔ ۔ قرآن میں ابراہیم کے باپ کا نام آذر بتایا گیا ہے اور مرداش ربا کی روایت میں تیراد ہے ۔ ۔ ۔ بعد کو لوگوں نے زیب داستان کے لیے وہ سب کچھ اضافہ کر لیا' جو مرداش ربا اور کلام مجید کی روایات میں پایا جاتا ہے'' (''نگار'' جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۶۲)

کیا قرآن نام ہے ''زیب داستان کے لیے لوگوں کے گڑھے ہوئے قصوں کا''؟ اس بولہبی جسارت اور ابوجہلی جہالت سے قطع نظر کیجیے' کیا کسی قرآنی روایت کی تکذیب اور تکذیب نہ سہی تضعیف کی یہ بھی کوئی دلیل ہے' دلیل قوی نہ سہی دلیل ضعیف سہی کہ وہ روایت پوری یا ادھوری' دوسری قوموں کی الہامی کتابوں میں' تاریخوں میں' نوشتوں میں موجود ہے؟ کیا اس جاہل کے نزدیک قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ جو بھی روایت بیان کرے گا' اس کی تائید نہ کسی تاریخ

ہو سکے گی، نہ اس کی شہادت میں کوئی کتبہ پیش ہو سکے گا؟ پھر آخر یہ "مرداش ربّا" کے نام کی رٹ کیوں لگی ہوئی ہے؟

اس کو بھی چھوڑیے، خود یہ مرداش ربّا آخر ہے کیا بلا؟ نیاز اس منتر کو بار بار اس طرح جپ رہا ہے کہ گویا یہ کوئی گُرزِ البرز شکن ہے کہ اس کے پڑھتے ہی نعوذ باللہ اسلام کا دارغ پاش پاش ہو جائے گا۔ لفظ کے معنی تفسیر اعظم یا تفسیر کبیر کے ہیں۔ کتاب عبرانی زبان میں ہے۔ ضخیم مجلدات میں تخمیناً ڈھائی ہزار سال قبل کی لکھی ہوئی۔ علماءِ اسرائیل و شارحینِ توریت کے قلم سے جناب "علامہ" جو بار بار اس بے تکلفی سے اس کا حوالہ دے رہے ہیں، اس کتاب کو سمجھ کر پڑھ تو یقیناً چکے ہوں گے۔ سمجھ کر نہ سہی بے سمجھے بھی کبھی اس کی تلاوت سے مشرّف ہوئے ہیں؟ تلاوت کو بھی جانے دیجیے، محض زیارت کب اور کہاں نصیب ہوئی؟ عبرانی زبان میں متبحر نہ سہی، حرف شناسی کی نوبت بھی کبھی آئی ہے؟ اصل عبرانی کو بھی چھوڑیے، ترجمہ کس زبان میں مطالعہ شریف میں آیا ہے؟ یونانی میں، لاطینی میں، جرمن میں، فرنچ میں؟ اچھا یہ بھی نہ سہی، انگریزی؟ نہیں؟ انگریزی کی تعلیم بھی حضور والا نے کس یونیورسٹی میں، کس کالج میں، کے دن کے لیے اتنی پائی ہے کہ علمی کتابوں کے مطالب بے تکلف نہ سہی، بہ تکلف بھی سمجھ سکیں؟ اللہ کے نام شدگزار بندے! اس کتاب کا نام اس جسارت کے ساتھ ایک بار نہیں پانچ بار لکھا ہے اور انگریزی اردو دونوں حروف میں لکھا ہے، کم از کم اس کا صحیح املا تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔ تفسیر کی کتاب کو عبرانی میں "مرداش" نہیں "مدراش" کہتے ہیں جس کا مادہ "دارش" ہے — جتنا وقت اپنے ہاتھ سے اپنی "علامیت" کا ڈھول پیٹتے ہیں

صَرف ہوتا ہے، کاش اس کا کوئی حصہ واقعی حصولِ علم میں بھی صَرف کیا ہوتا!
("صدق" جلد ۶ نمبر ۱ صفحہ ۲)۔

(۶)

"قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصوّرِ وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو" ("نگار" بابت جولائی ۱۹۴۰ء صفحہ ۶۴)

یہ "حد درجہ جاہلانہ عقیدہ" آپ سمجھے کیا ہے؟ یہ عقیدہ کہ قرآن خدا کا کلام ہے! دلیل پہلی یہ کہ جو خدا متکلم ہو، وہ واحد کیسے ہو سکتا ہے؟ واحد ہونے کے لیے تو خدائے ناطق کا نہیں، خدائے ساکت و صامت کا وجود ضروری ہے! دلیل دوسری یہ کہ رسول نے اگر اللہ کا پڑھا یا ہوا سبق دہرا دیا، تو اس میں بات ہی کیا ہوئی۔ بات تو جب ہے کہ وہ خود اپنے دل و دماغ سے گڑھ کر کوئی تعلیم، کوئی دین، کوئی قرآن پیش کریں؟ ——— جہلِ مرکب کی اس سے بڑھ کر حیرت انگیز مثال آپ کی نظر سے کہیں گذری ہے؟

"سچ پوچھیے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو" (صفحہ ۶۴)

"اگر قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، خدا کا بنایا ہوا ہے، تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے"؟ (صفحہ ۶۴)

"کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور

اگر کوئی خدا کلام کر سکتا ہے، تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوتِ اختراع کیا ثابت ہوتی ہے"؟ (ص۶۴)

گویا نیاز خاں رسول اللہ صلعم کی عظمت کے جب قائل ہوں گے، جب حضورؐ کو سرے سے منصب رسالت و سفارت ہی سے برطرف کر دیا جائے! ــــ جون کے مہینہ کے متن کفر و ارتداد کی شرح در شرح، جولائی کے مہینے میں آپ نے دیکھ لی؟

"میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضا یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے" (ص۶۵)

یعنی نیاز خاں بھی قرآن اور محمدؐ کے باہمی تعلق کی بابت بالآخر وہی سمجھے، جو ابو لہب اور ابو جہل تیرہ سو برس پہلے ہی سمجھے ہوئے تھے اور جو ہرمارگولیس اور ہرراج پال آج بھی سمجھے ہوئے ہے! ("صدق" جلد۲ نمبر۱ صفحہ۲)

(۷)

"میں واقعی مسلمان ہوں" "نگار" بابت جولائی ۱۹۴۰ء ص۲

یہ اُس نے کہا ہے جسے اصرار ہے اپنی کفریات کی اشاعت پر اور جو برابر کہے جا رہا ہے کہ قرآن کلام الٰہی نہیں، تصنیف محمدی ہے۔ آپ خوش ہوں گے کہ کہنے والے نے بہرحال کسی طرح اپنے مسلمان ہونے کا اقرار تو کیا، لیکن ابھی خوش نہ ہو جیے! متن کی شرح بھی انھی زبان میں حاضر ہے:

"آپ کو میرے اسلام کی طرف سے صرف اس لیے شبہ ہے کہ میرے عقائد عام عقائد سے علیحدہ ہیں، لیکن عام عقائد کا اختلاف ایک شخص کو

اس جماعت یا قوم سے علیحدہ نہیں کر سکتا جس میں اس کا نشو و نما ہوا ہے، اس لیے جب تک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ مجھے ملت اسلامی کے دائرہ سے خارج کر دے، خواہ میرے عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں" (ص۵)

اب فرمائیے! ایسے ظالم کا کیا کرے کوئی؟

نیاز محمد خاں صاحب، بہادر کے "عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں" وہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں کریں، جو چاہیں لکھیں، جو چاہیں چھاپیں، مجال ہے کسی کی کہ علم متعلقہ دین و شریعت کی روشنی میں اُن پر گرفت کر سکے؟ وہ پیدائشی مسلمان جو ٹھیرے! اُن کے معاملہ میں کفر و ارتداد کے معنی ہی کیا؟

"رہ گیا کفر و اسلام، سو اب یہ اصطلاحیں بالکل بے معنی ہیں اور صرف مولویوں اور پنڈتوں کے روٹی کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں" (ص۵)

اسے چھوڑیے کہ نگار خانہ کی رونق کن اصطلاحوں سے ہے اور نیاز صاحب کے "روٹی کمانے کا ذریعہ" کون سی اصطلاحیں بنی ہوئی ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ اتنے دل حسب دجل کی مثال کہیں آسانی سے آپ کو ملے گی؟

("صدق" جلد ۶ نمبر ۱۱ صفحہ ۲)۔

(۸)

"سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے: وما ینطق عن الھوٰی ۔ ۔ ۔ رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا" ("نگار" جولائی ۴۰ء ص۶)

"رسول نے جو کچھ قرآن میں کہا ہے، وہ ہوائی باتیں نہیں ہیں، ما ینطق عن الھوٰی" ("نگار" اگست ص۶۳)

عن الھوٰی کا ترجمہ جو شخص اصرار کے ساتھ "ہوائی باتیں" کر سکتا ہے، عربی کے "ہوٰی" کو اُردو کا "ہوا" قرار دے سکتا ہے کچھ بھی حیرت ہو سکتی ہے، اگر ایسی "باد ہوائی" باتیں کرنے والا سیاہ کو سفید کا، اندھیرے کو روشنی کا اور کفر کو اسلام کا مترادف ٹھیرالے اور ایک ہی وقت میں اپنے کو مسلمان بھی کہے جائے اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے سے انکار بھی کیے جائے؟ ("صدق" جلد ۶ نمبر ۵ صفحہ ۲)۔

(۹)

"جس طرح عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام کے سمجھنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح مجھے بھی ہے۔" ("نگار" اگست ۳۵ء)

لیکن اس "حق" سے منشی نیاز محمد خاں نے کیا فائدہ اٹھایا اور وہ قرآن اور اسلام کو کیا سمجھے؟ وہ یہ سمجھے اور یوں نتائج تک پہنچے:

"قرآن کو معجزہ کہنا اُسی وقت اہمیت رکھ سکتا ہے، جب ہم اسے رسول اللہ سے یعنی، ایک انسان سے منسوب کریں، ورنہ خدا کے کلام یا خدا کی کسی بات کو معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیوں کہ آفتاب کو سبھی آفتاب کہتے ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے؟ عبدالماجد کہتے ہیں کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک ایک لفظ منطوق خدا کا ہے اور اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کا کوئی لفظ ایسا نہیں، جو پہلے سے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو، اس لیے بجائے قرآن مجید کے عربی زبان ہی کو معجزہ کہنا زیادہ موزوں ہے"

("نگار" اگست صلا)

کلامیات، عقلیات، عقائد و منطق دونوں کے یہ نادر جواہر ریزے بہ جز اوراقِ "نگار" کے اور آپ کو کہاں ملیں گے؟ ("صدق" جلد ۶ نمبر ۱۵ صلا)

(۱۰)

"قرآن کا کلامِ خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ ہے اصل بحث جو میرے اور ہندوستان کے بعض مولویوں کے درمیان مابہ النزاع ہے" ("نگار" اگست صلا)

یہ اس لپاڑیے نے اگست کے مہینہ میں کہا، جو ابھی جون کے مہینہ میں کہہ چکا تھا کہ:

"کلامِ مجید کو میں نہ کلامِ خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہامِ ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں" ("نگار" جون صلا)

یعنی ملتِ اسلامیہ کی پہلی ہی ڈانٹ پڑتے اور مقاطعہ ہونا الگ رہا "مقاطعہ" کا نام آتے ہی وہ "با اصول" اور "بلند اخلاق" انسان جو صراحت کے ساتھ انکار کر رہا تھا کلامِ مجید کے کلامِ خداوندی اور الہامِ ربانی ہونے سے، لگا گڑگڑا کہنے اور قبولنے کہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے سے بھلا مجال ہے کہ میں انکار کروں میں تو صرف اس کا مفہوم اور اس کی نوعیت متعین کرنا چاہتا ہوں اور اس باب میں میرا اختلاف شریعتِ اسلام کے کسی مسلّمہ سے نہیں، صرف "بعض مولویوں" سے ہے! —— کون کہتا ہے کہ شیواجی کے پینترے صرف اورنگ زیبؒ ہی کے مقابلہ میں تھے اور اس کے بعد ناپید ہو گئے؟

(۱۱)

"اگر قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، تو پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے یہ معنی

ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے کلام مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ذات سے خطاب کرتا ہے، جو بالکل بے معنی سی بات ہے"

("نگار" اگست ۲۶ء)

یہ اُس مرتد نے کہا ہے، جو آب بھی مقاطعہ کے ڈر سے لرزہ براندام کہے چلا جاتا ہے کہ

"میں بھی مسلمان ہوں، میں بھی اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں" (ص۳)

اور بحمد اللہ میں کفار قریش میں سے نہیں ہوں" (ص۳)

"کفار قریش" میں سے بے شک آپ نہ ہوں گے، لیکن اُن سے ترقی کر کے ثلثیہ ہند، مشرکین ہند میں سے سہی! بانیٔ فرقۂ آریہ سماج دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا رسوائے عالم باب چہاردہم جس کسی کے پاس ہو (کتاب نایاب نہیں اور اس کا جواب حق پرکاش مولانا ثناء اللہ امرتسری کے قلم سے تو بہ آسانی مل جائے گا) وہ خود دیکھ لے کہ قرآن مجید پر سوڈیڑھ سو اعتراضات ایک سے بڑھ کر ایک مہمل اور گندے، جو اس کتاب میں درج ہیں، اُن میں سب سے پہلا نمبر بعینہٖ اسی اعتراض کا ہے یا نہیں! بروز ابوجہل کا نہ سہی، دیانند سرسوتی کا سہی! اب تو سخافت نگاری اپنی انتہا کو پہنچی! اور تسفل ذہنی کی پرواز اپنے ہم جنس کے ساتھ ہو گئی! ——— راست بازوں اور متقیوں کے سایہ سے بچنے والے اور بدکنے والے کو اِن مہاشہ مہاراج کا اُگال چاٹنا مبارک ہو! ("صدق" جلد ۶ نمبر ۱۶ ص۳)

(۱۲)

"اس طرح کی حکایتیں دنیا کے تمام مذاہب کے وجود سے قبل انسان کے عہدِ وحشت میں بھی جہل و کم علمی کی وجہ سے رواج پا چکی تھیں،

جن کو قرآن نے بھی اساطیر الاولین یا اصنامی روایتوں سے تعبیر کیا ہے" (نگار جون صفحہ ۶۹-۷۰)

"آتشِ نمرود کے واقعہ کو بھی جناب نیاز تاریخی واقعہ نہیں بتاتے بلکہ اساطیر الاولین میں شمار کرتے ہیں" (نگار اگست صفحہ ۶)

پہلی عبارت خود نیاز کے قلم کی ہے۔ دوسری ایک شارح نیاز یا نیاز مند کی۔ یہاں اس بحث کو تو چھوڑیے کہ دنیا کے تمام مذاہب کے وجود سے قبل انسان پر ایک عہدِ وحشت گذرنے کے مفروضہ پر کون سی دلیل موجود ہے؟ عقلی یا نقلی؟ اخری؟ قطعی نہ سہی، ظنی سہی؟ سردست سوال صرف دو ہیں:

۱۔ قرآن نے "جہل و کم علمی کی وجہ سے رواج پائی ہوئی روایتوں" کو اساطیر الاولین، ان تیس پاروں والے قرآن کے کس پارہ، کس سورہ، کس آیت میں کہا ہے؟

۲۔ آتشِ نمرود ہو یا قرآن کی بیان کی ہوئی کوئی سی روایت یا حکایت ہو، اُسے اساطیر الاولین میں شمار کرنے والے کون لوگ ہوئے ہیں؟

پہلے سوال کے جواب کے لیے تو نیاز کو مہلت آج سے قیامت کے دن تک کے لیے ہے۔ رہا دوسرا سوال، سو قرآن مجید میں یہ فقرہ نو بار آیا ہے اور ہر جگہ اس صراحت کے ساتھ کہ یہ مقولہ کفار کا ہے اور کفار میں سے بھی بدترین کا، جو وہ قرآن مجید کے لیے استعمال کرتے ہیں! یقول الذین کفروا ان ھذا الا اساطیر الاولین۔ وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ۔۔۔ وقالوا اساطیر الاولین۔ وقس علیٰ ھذا ـــــ ابوجہل کے اور دوسرے کفار قریش کے رٹے ہوئے آموختہ کو دُہرانا اور قرآن سے متعلق بعینہٖ وہی تحقیق"

شائع کرنا، جو چودہ سو سال پیشتر سے ابلیس کے شاگرد پیش کرتے چلے آئے ہیں، کام ہو سکتا ہے صرف سابق اہل کار دفتر پولیس اور حال "محقق" نیاز محمد خاں کا! ——— کوئی چور اس ڈھٹائی کے ساتھ "چراغ بہ کف" اس سے قبل کہیں دیکھنے میں آیا ہوگا؟ ("صدق" جلد ۶ نمبر ۱۶ ص ۳)

(۱۳)

"کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں تورات و انجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ تورات و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اس طرح کی حکایتیں دنیا کے تمام مذاہب بلکہ مذاہب کے وجود سے قبل انسان کے عہد وحشت میں بھی جہل و کم علمی کی وجہ سے رواج پا چکی تھیں جن کو قرآن نے اساطیر الاولین یا اضغاث روایتوں سے تعبیر کیا ہے"

("نگار" جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۶۹-۷۰)

ان چند سطروں میں سے ہر سطر کے اندر "نوادر" و "عجائب" کا جو انبار لگا دیا گیا ہے، ان سب سے قطع نظر صرف اس ایک سوال کو لیجیے کہ قرآن مجید میں "اساطیر الاولین" کسے کہا گیا ہے اور کہنے والا کون ہے؟ ——— آیا کچھ جھوٹی روایتیں اور حکایتیں انسان کے عہد جہالت و کم علمی کی یادگار ایسی تھیں،

جنھیں قرآن نے اساطیر الاولین کہا ہے؟ روایتیں اور حکایتیں نہ ہی کسی چیز کو بھی قرآن نے اس لقب سے پکارا ہے؟ قرآن نے کسی چیز کو بھی اس نام سے یاد کیا ہے؟ قرآن میں تو کافروں کے، مشرکوں کے، منافقوں کے بلکہ خود ابلیس کے مقولے کثرت سے نقل ہوئے ہیں، کیا ان میں سے کسی کے قول کو قرآن کا قول کہ دینا قرینِ صحت ہے! قرینِ دیانت ہے؟ خود نگارؔ میں نگار کش کے دل کو سوزوں کے اقوال برابر نقل ہوتے رہتے ہیں، کیا اُن میں سے کسی قول کی نسبت یہ کہ دینا درست ہو گا کہ نگارؔ نے یوں لکھا ہے؟ دین نہ سہی دیانت سہی، شرافت سے جس کسی کو ذرا بھی واسطہ ہو گا وہ ایسی جسارت کر سکتا ہے؟

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک جگہ نہیں، مختلف مقامات پر نقل ہوا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر جگہ مخالفین، منکرین، مکذبین کی زبان سے! اور یہ تو لقبہ وہی لقب ہے، جو اُن بدبختوں نے خود قرآن کو دیا تھا۔ قرآن محض اُن کے اس قول کا ناقل ہے، جس طرح اور بھی ان کے بہت سے بدبختانہ اقوال نقل کرتا گیا ہے۔ قرآن ظاہر ہے کہ کوئی نایاب کتاب نہیں، "نگار خانہ" میں اس کی جگہ ہو یا نہ ہو، لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کے گھر میں تو اس کے لیے جگہ، عزت و احترام کے ساتھ ہوتی ہی ہے، اسے کھول لیجیے اور ورق اُلٹتے ہوئے دیکھتے چلیے!

۱۔ سب سے پہلے یہ لفظ سورۂ انعام میں ملتا ہے۔ ذکر اللہ اور رسول کے شدید ترین معاندین کا چلا آتا ہے کہ ان کے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ان کے کان پر بھاری پن چڑھ چکا ہے اور ان کی قساوتِ قلب کی یہ نوبت پہنچ چکی ہے کہ کوئی سا بھی نشان دیکھ لیں، مگر یہ نہیں ماننے کے (ولن

يَرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا) تو ایسے کٹے کافر

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (انعام۔ آیت ۲۵)

جب آپکے پاس اے رسول لڑنے جھگڑنے آتے ہیں تو کہتے ہیں (اس قرآن کی بابت) کہ کیا ہے یہ جز اگلوں کے قصوں کہانیوں کے؟

۲۔ دوسری جگہ ذکر پھر ایسے ہی حد سے گذرے ہوئے کافروں کا آتا ہے کہ:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (انفال۔ آیت ۳۱)

جب انھیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں بس جی ہم نے سن لیا ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہیں کیا سوا اس کے کہ اگلوں کے قصے کہانیاں ہیں؟

۳۔ تیسرے مقام پر بھی تذکرہ ایسے ہی مکذبین و متکبرین کا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (نحل۔ آیت ۲۴)

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کیا نازل ہوا تو یہ کہتے ہیں کہ بس یہی اگلوں کے قصے کہانیاں۔

۴۔ چوتھی جگہ ذکر روشن خیال، دہریوں اور منکرین حشر کا ہے، گویا اپنے وقت کے نیاز فتحپوریوں کا:

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مر گئے اور خاک اور ہڈی ہو کر رہ گئے، تو کیا پھر سے اٹھائے جائیں گے؟ اجی اس طرح کے وعدے تو ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے ہوتے ہی چلے آئے ہیں۔ یہ کلام

الْاَوَّلِيْنَ ۝ (مومنون- آیت ۸۲) | ہے کیا بجز اگلوں کے قصے کہانیوں کے؟

۵- پانچویں جگہ ذکر ان ظالم و خبیث کافروں کا ہے، جن کا قول رسول اللہ صلعم سے متعلق یہ تھا کہ یہ کلام انھیں نے تو گڑھ لیا ہے اور ان کی کمک پر کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا - ان ہی کا قول یہ بھی تھا کہ

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝
(الفرقان- ۵)

یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں، جو اس نے لکھا رکھی ہیں اور وہی اس پر صبح و شام پڑھ کر سُنادی جاتی ہیں۔

۶- چھٹے مقام پر پھر ذکر منکرین حشر و مکذبین قیامت کا ہے، یہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
(النمل- آیات ۶۷-۶۸)

کافر کہتے ہیں کہ بھلا جب ہم اور ہمارے باپ دادا (مٹی میں مل کر) مٹی ہو گئے، تو کیا پھر نکالے جائیں گے؟ اجی یہ وعدے تو ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے پہلے بھی ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ (کلام) اور ہے کیا بجز اگلوں کے قصے کہانیوں کے!

۷- ساتویں آیت میں ذکر "روشن خیال" اولاد کا ہے۔ ماں باپ، بیٹے کی "روشن خیالی" سے عاجز آکر حق تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں اور اس ناخلف سے بھی ایمان لانے کو کہتے ہیں۔

فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ
(احقاف- آیت ۱۷)

مگر وہ یہی کہے جاتا ہے کہ یہ (کلام) تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

۸۔ آٹھویں آیت میں ذکر ایک بدبخت ترین قسم کے انسان کا ہے، نہایت بداطوار اور ناہنجار، اور ان ذاتی عیوب کے علاوہ بدنسب بھی۔ لفظ زنیم کے معنی ہیں: زنمہ ای المنتسب الی قوم ھو معلق بھم لا منھم (مفردات القرآن راغب) تو یہ بدبخت مال اور اولاد کے گھمنڈ میں بھولا ہوا۔

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ط (قلم۔ آیت ۱۵)	جب اُسے ہماری آیتیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں، تو یہی کہتا ہے کہ یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

۹۔ نویں آیت میں بھی ذکر ایک ایسے "عقل مند" کا ہے، جو عقیدۂ حشر کو اپنی "عقلیت" پر بار سمجھتا ہے اور بے دینی کے ساتھ ساتھ بداطواری میں مبتلا ہے:

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ط (تطفیف۔ آیۃ ۱۳)	اُسے جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو یہ کہتا ہے کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں!

غرض قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ آیا ہے، خود قرآن مجید کے حق میں خبیث معاندین کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ قرآن کا یہ نیا دشمن اگر اس میں کچھ بھی پاسِ دیانت و شرافت ہے، تو بتائے کہ ان تیس پارول والے قرآن نے آخر کہاں آتشِ نمرود جیسی حکایات کو اساطیر الاولین سے تعبیر کیا ہے؟ ("صدق" جلد ۶ نمبر ۱۷ صفحہ۔

(۱۴)

"علمائے کرام جواب دیں!" عنوان کسی آریہ سماجی یا کسی پادری کے مناظرانہ اشتہار یا پوسٹر کا نہیں، بلکہ اُن کے شاگردِ رشید نیاز فتحپوری کا ہے! حق

شاگردی مضمون کی پیشانی تک میں ادا کر دیا گیا ہے ——— نفسِ مضمون میں دس دلیلیں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے سے انکار یا اپنے ارتداد پر قائم کی ہیں، ایک دلیل حسبِ ذیل ہے:

"سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر مالکِ یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے کہ گویا مخاطب سامنے نہیں اور پھر دفعتہً ایاک نعبد سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی، تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا" (ص۶)

خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ چوں کہ قرآن میں صنعتِ التفات استعمال ہوئی ہے (یعنی صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب کی طرف انتقال) اس لیے اس سے نتائجِ ذیل برآمد ہوئے:

(۱) ایک یہ کہ دونوں ٹکڑے دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے۔ گویا رسول تو دو مختلف باتوں کو ملا سکتے ہیں، لیکن خدا اس پر قادر نہیں! (۲) دوسرے یہ کہ دنیا کے قرآن میں دو مختلف باتیں یک جا کر کے لکھی جا سکتی ہیں، لیکن اس نقشِ ثانی کا نقشِ اوّل لوحِ محفوظ میں اس طرح لکھا جانا ممکن ہی نہیں! ——— فرمائیے، اتنے زبردست "عقلی" اعتراض کا دنیا کے کسی منطقی، فلسفی، یا "معقولی" سے جواب بن پڑ سکتا ہے؟ علماء اور طلبہ سب کی ذہانتیں اور سب کے دماغ اگر ایسے موقع پر جواب نہ دے سکیں، تو اور کیا کریں؟

("صدق" جلد ۶ نمبر ۸ ص۲)

"نگار" فتنۂ روزگار

(جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی، دارالمصنفین اعظم گڑھ)

نیاز صاحب فتحپوری کو مذہب کے ساتھ جس قدر "تعلقِ خاطر" ہے، علم دوست حلقہ اس سے ناواقف نہیں ہے۔ عرصہ ہوا کہ مذہبی طبقہ کی "رقابت" سے تنگ آکر انھوں نے اس "کوچہ" میں قدم رکھنے ہی سے توبہ کرلی تھی، لیکن کچھ تو بات ہے کہ

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کو درمیان لائے بغیر ان کے "نگار خانہ" کی رونق ہی باقی نہیں رہتی ہے، اس لیے وہ اپنے اجتہادات سے مذہب کو سرفراز فرمانے پر مجبور ہیں!

"نگار" جون ۱۹۴۰ء کے باب الاستفسار میں کوئی محمد صالح صاحب مراد آباد سے دریافت فرماتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ کے متعلق کہ نمرود نے انھیں آگ میں پھینک دیا تھا اور آگ نے کوئی اثر نہ کیا، آپ کا کیا خیال ہے؟ کلام مجید میں اس واقعہ کا ہونا اس کا ثبوت ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے، کیوں کہ یہ الہامِ خداوندی ہے اور الہام غلط نہیں ہوسکتا۔"

نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ اس استفسار نے بحث کے تین پہلو پیش

کر دیے ہیں: ایک یہ کہ کلام مجید الہام خداوندی ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ قرآن میں اس واقعہ کا پایا جانا اس کی صداقت کا ثبوت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تیسرے یہ کہ نفسِ واقعہ کی تاریخی یا علمی حیثیت کیا ہے؟

کلام مجید کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق نیاز صاحب کا فتوٰے ہے:

"کلام مجید کو میں نہ کلامِ الٰہی سمجھتا ہوں، نہ الہامِ ربّانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں"

نیاز صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نافہموں کی ایک جماعت اس سے پہلے یہی خیال ظاہر کر چکی ہے۔ قرآن میں ہے:

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (مدثر)	پھر بولا اور کچھ نہیں، یہ جادو ہے، چلا آتا ہے اور کچھ نہیں یہ کہا ہوا ہے آدمی کا۔

فرق یہ ہے کہ اگلوں نے جو کہا تھا، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر اور آج کا یہ "حق گو" اس عقیدے کے باوجود اپنے کو مسلمان، مصلح امت اور مجدد وقت سمجھتا ہے، حالاں کہ کلامِ الٰہی کو کلام بشر کہنے والے کے لیے خدا کا فیصلہ ہے:

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (مدثر)	اب اس کو ڈالوں گا آگ میں

قرآن عزیز ایسے ہی لوگوں کے لیے تحدی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (بقرہ ۲۳)	اور اگر تم کو اس میں کچھ شک ہو، جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے، تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ!

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ۭ (یونس)

کیا یہ کفار کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اس قرآن کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے، اُن سے کہ دیجیے کہ اِس جیسی ایک سورۃ تم بھی لاؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۭ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ (طور)

کیا وہ یہ کہتے ہیں، پیغمبرؐ نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ بات یہ ہے کہ ان کو ایمان نہیں! اگر وہ سچے ہیں، تو اس جیسی ایک بات بھی وہ پیش کریں!

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

کہ دیجیے اے پیغمبرؐ! اگر تمام جن و انس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں، تو نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کی امداد پر کیوں نہ ہوں!

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۡ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۭ (بقرہ)

تو اگر تم ایسی صورت بنا کر نہ لا سکو اور یقیناً نہ لا سکو گے تو اس آتشِ دوزخ سے بچو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں گے جو کافروں کے لیے تیار رکھی گئی ہے۔

کیا نیاز صاحب بتلائیں گے کہ قرآن اگر انسان ہی کا کلام ہے، تو دنیا اس شدید ترین تحدّی کے باوجود اب تک اس کی مثال لانے سے کیوں عاجز ہے؟

یہ تحدّی آج بھی اپنی پوری صداقت کے ساتھ نیاز صاحب اور ان کے ہم مشربوں پر قائم ہے۔ اس تحدّی کے علاوہ بے شمار آیات میں قرآن نے اپنے کو

کلام اللہ ثابت کیا ہے۔ ایک جگہ تو صاف صاف ارشاد فرمایا:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْکَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (النساء)	کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا، تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو کلام بشر وہی کہہ سکتا ہے، جو تدبر قرآن کی نعمت سے محروم ہے۔ ارشاد ہوا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ (توبہ)	اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔
یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰہِ (فتح)	چاہتے ہیں کہ بدل دیں اللہ کا کلام۔

نیاز صاحب بتائیں کہ ان آیتوں میں کلام اللہ سے مراد کیا قرآن مجید کے سوا اور کوئی چیز ہے؟ فرمایا:

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (الزمر)	اُتارنا کتاب کا اللہ سے ہے، جو زبردست ہے، حکمت والا۔
وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ (النمل)	اور تجھ کو تو قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے۔
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (الدہر)	ہم نے اتارا تجھ پر قرآن، سہج سہج اُتارنا۔
وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد)	اور ایمان لائے اُس پر جو اتارا گیا محمد پر
وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء)	اور بے شک وہ اُتارنا ہے تمام جہان کے

اگر قرآن خدا کا کلام نہیں، بلکہ بشر کا کلام ہے، تو بار بار اس کی تنزیل اور تلقی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں ہو رہی ہے اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا (بے شک ہمیں نے اُتارا) هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ (وہی ہے جو اُتارتا ہے) کے تاکیدی جملے کیوں استعمال کیے جا رہے ہیں؟

نیاز صاحب کو قرآن کے کلام الٰہی تسلیم کرنے میں جو دقت نظر آئی، وہ ان کے الفاظ میں یہ تھی:

"کلام کا مفہوم اُس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا، جب تک نطق اس سے متعلق نہ ہو اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا، اس لیے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق بھی لازم ہوگا، جس کا تعلق یک سر مادیات سے ہے"

شہر کے اندیشے سے قاضی دُبلا رہتا ہے۔ بے چارے نیاز صاحب اللہ تعالیٰ کو مادیات سے بچانے کے لیے اسی فکر میں رہے کہ اس پر نطق کا داغ نہ لگنے پائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مصلحت معلوم نہیں کیا ہے کہ اس کو اپنے متکلم ہونے پر اصرار ہے، ارشاد ہوتا ہے:

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (بقرہ)	ان پیغمبروں میں سے بعض نے خدا سے باتیں کیں۔
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء)	اور خدا نے موسیٰؑ سے باتیں کیں۔
وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ (اعراف)	اور کلام کیا اُس سے اس کے رب نے۔
قَالَ يٰمُوْسٰى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ (اعراف)	فرمایا: اے موسیٰؑ! مَیں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ (بقرہ)	اور جب تیرے رب نے کہا فرشتوں سے۔
اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ (نازعات)	جب پکارا اُس کو اس کے رب نے۔
اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ (النحل)	ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں، یہی ہے کہ کہیں اُس کو ہو جا! تو وہ ہو جائے۔
سَلٰمٌ ۟ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (یٰسین)	سلام بولنا ہے رب مہربان سے۔

اہلِ دوزخ کی محرومی ہوگی کہ

وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ (بقرہ)	نہ بات کرے گا اُن سے اللہ۔

حیرت کا مقام ہے کہ یا تو خدا کو مادیات سے بلند رکھنے کی اس قدر کوشش کہ اس کے متکلّم ہونے ہی سے انکار! اور یا مادی مخلوقات ہی پر قیاس کرکے اس کو حرکتِ عضلات کے بغیر تکلّم سے بے مقدور و مجبور ٹھہرا دیا؟ ایں چہ بوالعجبی است!

حالاں کہ صاف ارشاد ہے کہ:

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (شوریٰ)	اُس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

جب اُس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے، تو اُس کو دوسروں پر قیاس کرنا اور اس کے لیے بھی وُہی احکام ثابت کرنا، جو دوسروں کے لیے ہیں، کہاں تک درست ہوگا؟

خدا تو صاف فرماتا ہے کہ قرآن میرا کلام ہے، اس کو مَیں نے وحی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ	یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں

اِلَيْكَ ۔ (یوسف)	تیرے پاس۔
اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ۔ (النساء)	اور ہم نے اے محمدؐ! تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی۔
بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ (یوسف)	اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن۔

لیکن نیازؔ صاحب کو اصرار ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم و فراست کا نتیجہ ہے، فرماتے ہیں:

"الہام یا وحی سے مراد وہ تاثرات ہوں گے، جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں وہ مروّجہ زبان میں نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دیتا ہے"

نتیجہ یہ نکلا کہ

"کلام مجید کو وحی کہتے ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی رسولؐ کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے!"

معلوم نہیں، وحی اور الہام کی اس تعریف کی سند کیا ہے؟

اگر وحی کے معنی "قلبی تاثرات" اور "فہم و فراست" ہی کے ہیں، تو فرمائیے آیاتِ ذیل کے کیا معنی ہوں گے:

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ (انعام)	یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات وحی کرتے ہیں۔
وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ	اور شیطان لوگ اپنے دوستوں کو وحی

اِلٰی اَوْلِیَآئِھِمْ ط (انعام)	کرتے ہیں۔

گزشتہ آیات میں بھی آپ نے پڑھا ہے کہ "ایحاء" (وحی کرنا) کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے، وہاں "قلبی تاثرات" یا "فہم و فراست" کے معنی کیا بنیں گے؟

"تاثر" ایک انفعالی کیفیت ہے اور "ایحاء" (وحی کرنا) انفعالی کیفیت نہیں ہے، پھر دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟

قرآن پاک بتلاتا ہے کہ اللہ کی ایک مخلوق ملائکہ ہیں، ان کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ خالق کے احکام کو مخلوقات تک پہنچائیں۔ فرمایا:

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا ط (حج)	خدا ہی ہے جو فرشتوں میں پیغام رساں منتخب کرتا ہے۔
جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا ج (فاطر)	فرشتوں کو پیام رساں بنانے والا ہے
اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ ط (الشوریٰ)	یا وہ کسی قاصد کو بھیجے، تو اس کے حکم سے وہ جو کچھ چاہتا ہے آدمی کو پہنچا دیتا ہے۔
نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۙ عَلٰی قَلْبِکَ ط (شعراء)	روح الامین نے اس کو تیرے قلب پر اتارا ہے۔
مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط (بقرہ)	جو جبریل کا دشمن ہے، وہ ہو، کیوں کہ وہی تو تیرے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارتا ہے

اگر وحی رسول کے فہم یا قلبی و دماغی تاثرات ہی کا نام ہے، تو فرمائیے کہ درمیان میں ملائکہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

عربی زبان میں وحی کے معنی حسب ذیل بتائے گئے ہیں:

الوحی الاشارۃ والکتابۃ والرسالۃ والالھام وکل ما القیت الی غیرك۔ (لسان العرب)	وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

دیکھیے اس میں "قلبی تاثر" کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ البتہ پیغام دینا، کلام کرنا اس کے معنی میں داخل ہے۔ آپ کو آیت اوحیٰ ربّك الی النّحل (تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کی طرف وحی کیا ہے) سے شبہ ہوا ہے جیسا کہ آپ خود بھی تسلیم کرتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ شہد کی مکھیوں پر عربی و عبرانی میں تو وحی نازل نہ ہوئی ہوگی، بلکہ اس سے مراد مکھی کی وہ فہم و ذکاوت ہوگی، جس کے زیر اثر وہ پھولوں کا رس چوستی ہے"

درست فرمایا، ہرگز شہد کی مکھی پر عربی عبرانی میں وحی نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کے دل میں بات ڈالی گئی (جیسا کہ وحی کے ایک معنی دل میں ڈالنے کے بھی ہیں) لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوا کہ وحی النحل اور وحی الانبیاء دونوں ایک ہیں؟ قرآن وحی الانبیاء کی بابت کہتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۔ (شوریٰ)	کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے روبرو کلام کرے، لیکن وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی آڑ سے، یا وہ کسی قاصد کو بھیجتا ہے تو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، آدمی کو پہنچا دیتا ہے"

یعنی بشر سے مکالمہ الٰہی کی تین شکلیں ہوئیں:

۱۔ کلام بالوحی۔
۲۔ کلام پسِ پردہ۔
۳۔ کلام بہ ذریعہ قاصد۔

کلام پاک کا نزول اسی آخری طریقے سے ہوا ہے یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لایا، اس کے مُنہ سے جو الفاظ ادا ہوئے، پیغمبر نے ان کو محفوظ کر لیا، اسی طرح صرف معانی و مطالب نہیں، بلکہ قرآن کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف وحی ہے۔ آیت ذیل اس مفہوم کی طرف پورا اشارہ کر رہی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝

(القیامہ)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر زبان اپنی تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے، اس کو جمع کرنا (تیرے سینہ میں) اور پڑھنا (تیری زبان سے) پھر جب ہم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی) تو پیروی کر اس کے پڑھنے کی!

حضرت جبریل قرآن لے کر آتے اور اس کی آیات تلاوت کرتے، تو ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلدی یاد کرلیں۔ اس صورت میں آپ کو سخت مشقت ہوتی تھی۔ خدا نے فرمایا کہ اس تیز پڑھنے اور زبان ہلانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تمہارے سینہ میں حرف بہ حرف جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے!

غور کیجیے، اگر قرآن کے حروف و الفاظ کی بھی وحی نہیں ہوتی تھی تو "تحریک لسان" کی ضرورت کیوں پیش آتی تھی اور من جانب اللہ "جمع" اور "قرآن" کی تسلی کیوں دی گئی؟

اسی طرح آیاتِ ذیل پر غور کیجئے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف)	ہم نے اُتارا اس کو عربی زبان میں۔
اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (رعد)	ہم نے اُتارا اس کو عربی حکم۔
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (شوریٰ)	ہم نے عربی قرآن کو تیری طرف وحی کیا۔
وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا (احقاف)	یہ کتاب ہے، جو تصدیق کرتی ہے عربی زبان میں۔

بار بار قرآن کے ساتھ عربی زبان کی قید کیوں لگائی جارہی ہے؟ کیا اس کا انتہائی واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کے مفہوم و مطالب کی طرح اس کی زبان بھی الہامی ہے؟

قرآن پاک کی آیات تحدی پر بھی (جو پہلے نقل ہوچکی ہیں) ایک نظر ڈال لیجیے بار بار کہا گیا کہ اگر تم کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے تو اسی کے مثل لے آؤ۔ یہ مثلیت کس چیز میں ہو؟ اس کی کوئی خاص تصریح نہیں ہے۔ علماء محققین کہتے ہیں کہ مثلیت قرآن کے تمام اوصاف میں مطلوب ہے۔ قرآن کے اوصاف کثیرہ میں فصاحت و بلاغت بھی ایک وصف ہے۔ چنانچہ معتزلہ میں سے جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ چیز بھی واضح رہے کہ "فصاحت" کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے الفاظ و حروف اور اس کا نظم من جانب اللہ نہیں تھا، تو باوجود سخت ترین تحدی کے دنیا اس کے مثل کیوں ایک سورۃ بھی نہ لا سکی؟

الغرض یہ تمام چیزیں اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ قرآن رسول کی فہم و فراست کا

نتیجہ نہیں، بلکہ الفاظ اور معانی و مطالب ہر حیثیت سے وحی الٰہی ہے۔

آگے چل کر نیاز صاحب فرماتے ہیں:

"الہام خداوندی کو کسی ایک یا ایک سے زائد مخصوص زبانوں میں محدود کر دینا خدا کی صفت کو محدود کر دینا ہے"

سبحان اللہ! یہ تحدید صفات کا مسئلہ آپ نے خوب چھیڑا، لیکن اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ جس طرح وحی کرنا اللہ کی ایک صفت ہے، اسی طرح خلق، رزق، احیاء (زندہ کرنا)، اماتت (مارنا) وغیرہ بھی صفات خداوندی ہیں اور ان کے مظاہر بھی دنیا میں محدود ہی ہیں، تو کیا یہ صفات بھی محدود ہو گئیں؟

صفاتِ خداوندی کی یہ تحدید اختیاری ہے یا اضطراری؟ اگر اختیاری ہے، یعنی، خدا نے جس زبان میں چاہا، جس ملک میں چاہا، جس شخص پر چاہا، وحی کیا اور جس پر نہ چاہا، نہ کیا، تو اس میں سقم کیا لازم آیا؟ جیسا کہ فرمایا:

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (بقرہ)	اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے، مخصوص کرتا ہے۔

اور اگر یہ تحدید اضطراری ہے، یعنی، اس تخصیص کے لیے خارج سے کوئی قوت کارفرما ہے، تب البتہ جائے سخن ہے!

اسی ضمن میں نیاز صاحب فرماتے ہیں:

"صرف اہل عرب کی زبان میں اپنا کلام نازل کرنا اور تمام دنیا کے انسانوں کو مجبور کرنا کہ وہ اُسے سمجھیں اور کلام ربانی قرار دیں، کسی طرح قرین انصاف نہیں قرار دیا جا سکتا"

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

جس طرح تمام عالم کے لیے تھی، اسی طرح اپنی قوم کے لیے بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اس قوم (عرب) میں کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ قرآن میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (الجمعہ)	وہی خدا جس نے اَن پڑھوں میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

اس آیت میں لفظ "اُمِّیّٖنَ" قابل غور ہے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (یٰسٓ)	تاکہ تو اُس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ہر نبی کے پاس اسی کی قوم کی زبان میں وحی آتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراھیم)	اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا۔

اس اصول کے پیش نظر قرآن کا عربی زبان میں ہونا عین قانونِ خداوندی کے موافق ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ تمام اقوامِ عالم کو کیوں مجبور کیا گیا کہ وہ اس زبان کو سمجھیں؟ تو یہ سرے سے غلط ہے۔ قرآن یا حدیث میں کہاں حکم ہے کہ ہر شخص پر عربی پڑھنا فرض ہے؟ کیا دنیا کے جتنے مسلمان ہیں سب عربی دان ہیں؟ اور بغیر عربی کے ان کا ایمان مسلّم نہیں ہے؟ اس کے سوا کیا حصولِ عربی "تکلیف مالایطاق" ہے؟ اگر نہیں ہے تو قرآن کا عربی میں ہونا کون سی ناانصافی ہے؟

ہم یہاں ان مباحث کو نہ چھیڑیں گے کہ عربی زبان اپنی جامعیت و

کاملیّت کے لحاظ سے تمام دوسری زبانوں پر فوقیّت رکھتی ہے اور وحی الٰہی کی مکمل تشریح کے لیے یہی زبان مناسب تھی۔

ان مباحث سے فارغ ہونے کے بعد نیاز صاحب بحث کے دوسرے پہلو پر آتے ہیں، یعنی:

"کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصّہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت اور انجیل کے حوالے سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی قائم تھا، اس لیے رسول اللہ نے ان کو اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط؟"

خلاصہ یہ ہوا کہ نیاز صاحب کے نزدیک

۱۔ قصصِ قرآن تاریخی نہیں ہیں۔

۲۔ قصصِ قرآن بائبل سے ماخوذ ہیں۔

قصصِ قرآن کی تاریخیّت کے متعلق اوّلاً خود قرآن پاک کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا	البتہ ان کے احوال میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے۔ کچھ بنائی ہوئی بات نہیں ہے،

يُفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ	لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے
بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف)	پہلے ہے۔
وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ (مائدہ)	اور سُنا ان کو حال واقعی آدمؑ کے بیٹوں کا
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ (کہف)	ہم سُناتے ہیں تجھ کو ان کا حال تحقیقی۔
نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (القصص)	ہم سناتے ہیں تجھ کو احوال موسیٰ اور فرعون کا تحقیقی۔

ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کس بلند آہنگی کے ساتھ اپنے قصص کی واقعیت اور تاریخیت کا اعلان کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ "طبع زاد افسانے" نہیں ہیں! قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ قصص قرآن کی صداقت اور تاریخیت کا محض دعویٰ کر دیا ہو، بلکہ اس نے دعوت دی کہ تم خود ان باقی ماندہ مقامات کو جا کر دیکھ لو، جہاں "ایام اللہ" کے اس قدر شان دار تاریخی واقعات گذرے ہیں۔ فرمایا:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (روم)	کیا پھرے نہیں وہ ملک میں کہ دیکھ لیتے کیا انجام ہوا اُن سے پہلوں کا؟
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ (ھود)	یہ تھوڑے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض ان میں سے اب تک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی۔
وَتَرَكْنَا فِيْهَآ لِلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (ذاریات)	اور باقی رکھی ہم نے اس میں نشانی اُن لوگوں کے لیے، جو ڈرتے ہیں دردناک عذاب سے۔

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت)	اور تم گذرتے ہو ان پر صبح کے وقت اور رات کو بھی پھر کیا نہیں سمجھتے؟

ذرا غور کیجیے۔ قرآن ان مقامات کے مشاہدہ عینی کی دعوت دیتا ہے۔ دعویٰ کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر مقامات اب بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تم صبح و شام اپنے سفروں ان مواقع سے گذرتے بھی ہو!

لیکن کیا بات ہے کہ ان بلند دعاوی کے مقابلے میں مکّہ کے سخت ترین دشمنوں کی زبان پر حرفِ انکار نہیں آتا، حالاں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے تن من، دھن سے رسول کی تکذیب و تذلیل میں لگے ہوئے ہیں؟ اگر ان واقعات پر ان کو یقین نہ تھا یا ان میں سے بعض کو وہ خود حسب شہادتِ قرآن اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے، تو اس کے خلاف آواز بلند کرنے سے ان کو کون سی چیز مانع تھی؟ اس کے بعد علماء آثارِ قدیمہ کو لیجیے کہ جیسے جیسے ان کی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، زمین اپنا سینہ چاک کر کے ان کے سامنے قرآنی بیانات کی تصدیق کر رہی ہے، اگرچہ قرآن اپنی صداقت میں کسی دوسرے کی تائید کا محتاج نہیں ہے!

نیاز صاحب کا دوسرا خیال یہ ہے کہ قصص قرآن، بائبل سے ماخوذ ہیں۔ یہ وہ خیال ہے، جس پر صحفِ سماوی کا طالب علم ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلے قرآن کے اس دعویٰ کو سن لیجیے کہ سارے تاریخی احوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو من جانب اللہ پہنچے ہیں۔ فرمایا:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۝	ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان اس لیے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن

وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف)
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ
(آل عمران)

اور تو تھا اس سے البتہ بے خبروں میں۔
یہ گزشتہ زمانے کی خبروں میں سے ہیں جن کو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں۔ تو اس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھا جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے تھے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے گا؟ اور نہ تو اُن کے پاس اُس وقت تھا جب وہ جھگڑا کر رہے تھے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۝ (قصص)
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ (یوسف)

اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰؑ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا، لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی اُن پر مدت اور تو نہ تھا مدین والوں میں کہ ان کو سناتا ہماری آیتیں، پر ہم رسول بھیجتے رہے ہیں اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی، لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا۔

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھیرانے لگے اپنا کام۔

آپ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے ذریعے جو باتیں پھیلی تھیں حضورؐ

اُن ہی کو بلا تحقیق بیان کر دیا، حالاں کہ دنیا جانتی ہے کہ نبوّت سے پہلے کی حضورؐ کی تمام زندگی مکہ معظمہ میں گذری اور مکہ معظمہ میں ان واقعات کا کوئی واقف کار نہ تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ امم ماضیہ کے احوال زیادہ تر مکّی سورتوں میں بیان کیے گیے ہیں۔ قرآن میں ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود)	یہ گزشتہ زمانے کی باتیں ہیں، جن کی وحی کے ذریعے ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں۔ تو خود اور تیری قوم اس سے پہلے آگاہ نہ تھی۔

قرآن نے بائبل کے واقعات کو نقل نہیں کیا، بلکہ ان میں سے بعض کی تصدیق، بعض کی تکذیب اور بعض کی تصحیح کی۔ قرآن کے مدّعیانہ لہجے پر غور کیجیے!

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (نمل)	یہ قرآن سناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جن میں وہ جھگڑ رہے ہیں۔
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ (مائدہ)	اے کتاب والو! تحقیق آیا ہے تمھارے پاس رسول ہمارا، ظاہر کرتا ہے تم پر بہت سی چیزیں جن کو تم چھپاتے تھے کتاب سے۔

اگر قرآن، بائبل کا ناقل ہی تھا، تو آخر کس علم کی بدولت اس نے اہلِ کتاب کی تحریفات کا راز فاش کیا اور علی الاعلان کہا:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (نساء)	پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا	پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب کو لکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ

مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ (بقرہ)	کی طرف سے ہے۔

بائبل اور قرآن دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دونوں کے قصص و واقعات کا مقابلہ کر لیجیے۔ حقیقت خود بہ خود آشکار ہو جائے گی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

انجیل نے اپنے طرزِ بیان سے ظاہر کیا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ (لوقا باب ۲)

مگر قرآن نے کھلے طور پر اس کی تردید کی:

وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ (مریم)	اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا۔

حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا کہ وہ نعوذ باللہ غیر عورتوں سے مانوس تھے۔ غیر معبودوں کی طرف مائل تھے۔ (سلاطین باب ۱۱)

قرآن نے کہا:

وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ (بقرہ)	اور سلیمانؑ نے کفر کا کام نہیں کیا۔

حضرت داؤدؑ کے لیے بائبل نے بیان کیا کہ وہ اپنے ایک فوجی کی حسین عورت کو غسل کرتے دیکھ کر عاشق ہو گئے۔ (کتاب سموئل باب ۱۲)

اس کے برخلاف قرآن حضرت داؤدؑ کی توبہ و انابت کا حال سناتا ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (ص)	اور یاد کر ہمارے بندہ داؤدؑ قوت والے کو وہ تھا رجوع رہنے والا۔

بائبل حضرت نوحؑ کو مے نوش بتاتی ہے۔ (پیدائش)

لیکن قرآن حضرت نوحؑ کو صفائی دیتا ہے:

یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ (اعراف)	بولا اے میری قوم ہرگز بہکا نہیں۔

بائبل نے حضرت لوطؑ کو مے نوش کہا اور کہا کہ ان کی دونوں بیٹیاں اُن سے حاملہ ہوئیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) (پیدائش ۱۹)

لیکن قرآن حضرت لوطؑ کا اسوہ یہ بتلاتا ہے:

وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اعراف)	اور بھیجا لوطؑ کو جب کہا اُس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اس کو جہان میں۔

اس بحث کو جس قدر طول دیجیے، طویل ہوتی جائے گی۔ مقصود تو صرف یہ دکھلانا ہے کہ قرآن اپنی تعلیمات و واقعات میں وحی الٰہی کے سوا ہرگز کسی دوسرے کا رہونِ منت نہیں ہے!

حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ جو زیر بحث ہے، اسی کو دیکھ لیجیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی، قوم کے ساتھ مناظرہ، باپ کو نصیحت، بادشاہِ وقت سے مناظرہ، آگ میں ڈالا جانا، اس سے نجات پانا، الغرض ان تمام واقعات کو قرآن کس تفصیل کے ساتھ بیان کر رہا ہے، لیکن بائبل ان تمام باتوں سے بالکل خاموش ہے۔ پھر بھی نیاز صاحب کو اصرار ہے کہ قصصِ قرآن، بائبل سے ماخوذ ہیں!

اور کہیں واقعہ بھی ہو کر کسی مسئلے یا کسی واقعے میں قرآن اور بائبل دونوں متفق ہوں، تو سوال یہ ہے کہ یہ اتفاق واقعہ یا مسئلہ کی تغلیط کا سبب کس اصولِ عقلی یا شرعی سے بن سکتا ہے؟

(۲)

"نگار" ماہ جون ۱۹۶۲ء میں ایک استفسار کے جواب میں نیاز فتحپوری نے

وحی اور کلام الٰہی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ قطعی غلط اور مذہبی نقطۂ نظر سے گمراہ کن تھے، اس لیے ان کی پوری تردید "زمزم" لاہور کی دو اشاعتوں میں کی گئی تھی۔

لیکن "نگار" ماہ جولائی ۱۹۴۰ء میں نیاز صاحب نے اسی مسئلے کے متعلق اپنے مسلک کو پھر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اصل مسئلہ معلوم کر کے اپنا عقیدہ صحیح کرتے، فرماتے ہیں:

"میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو خدا کا کلام کہنا نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے، بلکہ اس صحیح تصوّرِ وحدانیت کے بھی منافی ہے، جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے"

یہ تو دعویٰ ہوا، دلیل آگے ملاحظہ ہو، لیکن واضح رہے کہ نیاز صاحب اس بحث میں احادیث، تفاسیر اور اقوالِ سلف سے استناد نہ کریں گے، کیوں کہ ان کے نزدیک

"یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں"

بلکہ کلامِ پاک کی آیات سے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن مجید، کلامِ الٰہی نہ ہونے کے باوجود (جیسا کہ نیاز صاحب کا عقیدہ ہے) جھگڑے سے خالی تو نکلا۔

پہلی گفت وگو وحی کی حقیقت پر ہے۔ فرماتے ہیں:

"وحی کے لغوی معنی اشارہ سریع یا الہام بہ سرعت کے ہیں اور اُردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سُوجھ بوجھ" کے فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے"

امام راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں وحی کے لغوی معنی اشارہ سریعہ کے بتائے ہیں، جس کا ترجمہ "تیز اشارہ" ہو سکتا ہے۔

رئیس التحریر نیاز فتحپوری کے علم و فضل کے قربان جائیے کہ اُن کی اصطلاح میں اشارہ سریعہ کے معنی "برمحل سوجھ بوجھ" کے ہیں۔ اسی علم و فہم قرآن کا دعویٰ ہے؟

بریں عقل و دانش بہ باید گریست

وحی کی لغوی توضیح کے بعد قرآنی توضیح ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

"وحی خدا کی دین اور نتیجہ ہے اُس ذہنی قوت کا جو فطرۃً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چوں کہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر فعل و قول صرف نوع انسان کی خدمت کے لیے ہوتا تھا، اس لیے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور اُن کے مُنہ سے جو کچھ نکلتا تھا، اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا"

معلوم نہیں، یہ قرآنی توضیح قرآن کی کس آیت سے ماخوذ ہے؟ اس عبارت کے جملے ایک دوسرے سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس پر بھی غور فرمالیجیے!

"وحی خدا کی دین ہے، نبی کی ہر بات وحی کا نتیجہ اور اس کے مُنہ سے نکلی ہوئی ہر چیز اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہے اور پھر وحی ذہنی قوت کا نام بھی ہے"

بارے یہاں وحی کو خدا کی دین تو کہا گیا۔ نگار، ماہِ جون میں دعویٰ تھا:

"الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے، جو ایک انسان یا رسول

کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں"

اسی طرح یہاں نبی کی ہر بات اللہ کی طرف سے تسلیم کی جاتی ہے لیکن "نگار" ماہ جون میں ارشاد ہوا تھا:

"کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت اور انجیل کے حوالے سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے علم طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط؟"

نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا تاریخی حصہ من جانب اللہ نہیں ہے۔ اب نیاز صاحب خود ہی فیصلہ کریں کہ ان کی کون سی بات صحیح ہے؟

وحی کا مفہوم | وحی کے متعلق صحیح مسلک یہ ہے کہ لغوی حیثیت سے اس کے معنی حسب ذیل ہیں:

الوحی الاشارۃ والکتابۃ و الرسالۃ والالہام وکل ما القیت الی غیرک (لسان العرب)	وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈال دینا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

شعراء عرب برابر ان معانی میں لفظ وحی کا استعمال کرتے ہیں۔

بعض جگہوں پر قرآن پاک میں بھی یہ لفظ اپنے انہی معنی میں مستعمل ہے

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ (نحل)	تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کیا۔
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (زلزال)	تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کی،
وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَی الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (مائدہ)	میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔

ان لغوی معانی کے علاوہ اصطلاحاً انبیاء کے ساتھ مکالمہ الٰہی کو بھی وحی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (شوریٰ)	کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس کے ساتھ وہ بدو کلام کرے، لیکن وحی کے ذریعے سے یا پردے کی آڑ سے یا وہ قاصد کو بھیجے، تو اس کے حکم سے وہ جو کچھ چاہتا ہے آدمی کو پہنچا دیتا ہے۔

مکالمہ الٰہی کی یہ تینوں شکلیں وحی کی تین قسمیں بھی ہیں اور ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے۔ وحی کا لفظ مکالمہ الٰہی کے ان تینوں طریقوں کے متعلق جہاں بھی استعمال ہوگا، ظاہر ہے کہ اپنے لغوی معنی سے الگ ہوگا۔ ایسی صورت میں وحی کے لغوی معنی کو جو قرآن پاک میں غیر انبیاء بلکہ حیوانات اور جمادات کے لیے استعمال ہوا ہے، وحی الانبیاء کے مماثل قرار دینا اور دونوں کا ایک ہی مفہوم سمجھنا سخت ترین غلطی ہے۔ نیاز صاحب اپنے پورے مضمون میں اسی غلطی کے شکار ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجنے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل

ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

نیاز صاحب نے لفظ "وحی" دیکھا، اس کے محل استعمال کو نہ دیکھا۔ رئیس التحریر سے ایسی غلطی کی توقع نہ تھی۔ غور کیجیے کہ مکالمۂ الٰہی کی ان شکلوں میں سے کلام پس پردہ اور کلام بہ ذریعہ قاصد و فرشتہ، انبیاء کے سوا کہیں بھی پایا جاتا ہے؟ جب ایسا نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ وحی کی وہ قسمیں ہیں، جو انبیاء کے لیے مخصوص ہیں۔ پھر عام و خاص کے فرق کو نظر انداز کر کے سب کے لیے ایک ہی حکم لگانا کس عقل مند کا کام ہے؟

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ (قصص)	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کیا کہ اس بچے کو دودھ پلاؤ۔
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ (الانعام)	یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں وحی کرتے ہیں دھوکہ دینے کے لیے۔

ان آیات میں وحی کا لفظ اپنے لغوی معنی[1] میں استعمال کیا گیا ہے،

کلامِ الٰہی کی بحث اس کے بعد وہ آیات جن میں قرآن کو وحی الٰہی کہا گیا ہے، نیاز صاحب نقل کر کے فرماتے ہیں:

"ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے، لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔"

یہاں نیاز صاحب قرآن کو وحی الٰہی ماننے کے لیے تیار ہیں، لیکن "نگار" ماہ جون میں فرماتے ہیں:

---

[1] فطری ہدایت دل میں ڈالنا چپکے سے بات کرنا۔

"کلام مجید کو میں نہ کلام الٰہی سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی، بلکہ انسان کا کلام جانتا ہوں"۔

اس تضاد اقوال سے قطع نظر قابلِ توجہ یہ اجتہاد ہے کہ نیاز صاحب قرآن پاک کو الفاظ سے نہیں بلکہ علم و حکمت کے لحاظ سے وحی مانتے ہیں!

مضمون کے ابتدا میں وعدہ تھا کہ آیاتِ قرآنی سے مسائل مدلل کیے جائیں گے، لیکن افسوس کہ ایسے اہم دعویٰ پر ایک آیت بھی دلیل میں نہ پیش کی گئی۔

ہم اگرچہ پوری تفصیل کے ساتھ اس مسئلے کو صاف کر چکے ہیں، تاہم اجمالی طور پر یہاں بھی کچھ عرض کرتے ہیں:

قرآن پاک صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنے الفاظ و حروف کے لحاظ سے بھی وحی الٰہی ہے۔ یہ ہے اسلامی عقیدہ! دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن میں کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ صرف اس کے معانی الہامی ہیں اور الفاظ غیر الہامی۔ اس کے برعکس بے شمار آیات میں نفس قرآن کو من جانب اللہ کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ (نمل)	اور تجھ کو تو قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے۔
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝ (دہر)	اس واسطے یہ بھیجا ہم نے تیری طرف قرآن۔

۲۔ قرآن میں ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ	نہ چلا اس کے پڑھنے میں اپنی زبان تاکہ جلدی

بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامہ)	اس کو سیکھ لے۔ وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا (تیرے سینے میں) اور پڑھنا (تیری زبان سے)

حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن لے کر آتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد جلد دل میں پڑھتے جاتے، تاکہ یاد کرلیں۔ خدا نے فرمایا کہ اس وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تمھارے سینے میں حرف بہ حرف جمع کردینا اور تمھاری زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے!

قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ اگر قرآن کے حروف و الفاظ کی بھی وحی نہ ہوتی، تو "تحریکِ لسان" کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اللہ کی طرف سے "جمع" کی تسلی کیوں دی گئی؟

اسی مفہوم کی ایک دوسری آیت ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ۔ (طٰہٰ)	اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو!

۳۔ قرآن میں بار بار کہا گیا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف)	ہم نے اُتارا اس کو عربی زبان میں۔
اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (رعد)	ہم نے اتارا اس کو عربی حکم۔
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (شوریٰ)	عربی قرآن کو تیری طرف وحی کیا۔
وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا (احقاف)	یہ کتاب ہے جو تصدیق کرتی ہے عربی زبان میں۔

سوال یہ ہے کہ بار بار اللہ تعالیٰ عربی زبان میں "تنزیل" اور "ایحاء" کی نسبت اپنی طرف کیوں کرتا ہے؟ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کے مفہوم

ومطالب کی طرح اس کی زبان بھی الہامی ہے۔

۴۔ اگر قرآن کے الفاظ الہامی نہیں ہیں، تو انبیاء کے ساتھ مکالمہ الٰہی میں، کلام پس پردہ اور کلام بہ ذریعہ قاصد فرشتہ کی کیا شکل ہوتی تھی؟ جیسا کہ فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ (شوریٰ)	کسی بشر کی تاب نہیں کہ خدا اس سے دو بدو کلام کرے لیکن وحی کے ذریعے سے یا پردے کی آڑ سے وہ کسی قاصد کو بھیجتا ہے تو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، آدمی کو پہنچا دیتا ہے۔

۵۔ اگر قرآن پاک کے حروف و الفاظ الہامی نہیں ہیں، تو باوجود شدید ترین تحدّی کے دنیا فصاحت و بلاغت ہی میں اس کی مثل ایک سورۃ بھی کیوں نہ لا سکی؟

۶۔ اگر قرآن بھی کلام رسول ہے، تو قرآن اور اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نمایاں فرق کیوں پایا جاتا ہے؟

ایک غیر معقول شبہ

نیاز صاحب کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں پہلے جو مشکل نظر آئی تھی، اس کو وہ اس مرتبہ بھی بیان کرتے ہیں:

"اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوقِ خداوندی کہیں گے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی"

"گفت و گو نطق اور الفاظ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لیے ضروری ہیں"

سوال یہ ہے کہ آپ اس تخیل پر کیوں مجبور ہیں؟ جب خدا نے اپنے لیے اس قسم کی صفات کو بیان فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ | اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

تو اس کے کلام "سمع و بصر" اس کی "حیاۃ" وغیرہ کو آپ مادی اشیاء پر قیاس کیوں کرتے ہیں؟ جب آپ قرآن سے الگ ہوں گے؟ تو اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائیں گے!

اور پھر بقول مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہٗ:

"اس منطق کو یہیں تک محدود کیوں رکھیے؟ کیوں نہ کہیے کہ بصارت چوں کہ نام ہے آنکھ کے مخصوص عضلات کی حرکت کا اور سماعت چوں کہ نام ہے کان کے پردوں اور عضلات کے تاثر کا اس لیے خدا کو بصیر کہہ سکتے ہیں نہ سمیع! اور چوں کہ ارادہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کے نظام عصبی کی فعلیت کا اس لیے خدا کو صاحبِ ارادہ کہنا اس کا صاحبِ اعصاب، صاحبِ دماغ وغیرہ ہونا تسلیم کرنا ہے اور پھر چوں کہ زندگی نام ہے سانس کی آمد و شد کا، قلب کی حرکت کا اس لیے خدا کو زندہ کہنا اس کے لیے شرائین، خون اور آلاتِ تنفس وغیرہ کا تسلیم کرنا ہے اور اس طرح جتنی بھی صفاتِ جمالیہ و کمالیہ آج تک اللہ کے لیے تسلیم کی گئی ہیں، سب سے ایک ایک کر کے انکار اسی طرح کیا جا سکتا ہے اور پھر تمام اعراض و صفات سے معرّیٰ محض ہو کر نفسِ وجود ہی کب ثابت رہ سکتا ہے؟"

رسول کا معیار شرف

نیاز صاحب کو قرآن کے کلام الٰہی تسلیم کرنے میں دوسری جو نئی مشکل پیش آئی، وہ یہ ہے:

"اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے، تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے؟"

سبحان اللہ وماشاء اللہ! گذارش یہ ہے کہ خدا نے رسول کے لیے معیارِ شرف یہ کب ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنی طرف سے قرآن بنا لیتا ہے! قانونِ خداوندی میں تو شرف نہیں، بلکہ جرم ہے۔ ارشاد ہوا:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (الحاقۃ)

رسول کا اصل شرف تو یہ ہے کہ خدا نے اپنی پیغمبر کے لیے اس کا انتخاب کیا، اس کو دنیا کے لیے نمونۂ عمل بنا کر بھیجا، اس کا وجود مستقل ہدایت ہے۔

بے شک رسول محض پیغام پہنچانے والا قاصد نہیں ہے کہ جس کو پیغام کے مفہوم و معانی سے کوئی سروکار نہیں، لیکن وہ شارع بھی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے قرآن پیش کرے۔ ہم اس کو صحیفۂ الٰہی کا شارح مانتے ہیں۔ قرآن پاک بھی اسی چیز کو پیغمبر کا وصف بتلاتا ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (جمعہ)	وہ (رسول) اُن (اَن پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔
وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (نحل)	اور ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف نصیحت کی کتاب کو اُتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے، تو اس کو ان کے لیے کھول کر

بیان کردے۔ شاید وہ سوچیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء)	ہم نے (اے پیغمبرؐ) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سمجھائے، اس کے ذریعے فیصلہ کرے

غور فرمائیے! ان آیات میں رسول کا یہ منصب کہیں نہیں بیان کیا گیا ہے کہ وہ آیات قرآنی کو اپنے دل و دماغ سے پیدا کرے، بلکہ اس کا منصب اعلیٰ، تعلیم کتاب، تزکیہ، تبیین اور حکم ہے۔

اس تفصیل سے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کو کلام الٰہی نہ سمجھنا قطعاً غیر اسلامی عقیدہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اس کے الفاظ و حروف کے اختراع کی نسبت کرنا آپؐ پر بہتان لگانا ہے۔ فھل من مدکر؟

(زمزم)

حقیقتِ وحی

(جناب ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر' ایم اے' پی ایچ' ڈی' کیمبرج)

اگر اس مضمون کی نگارش پر کوئی اجر و ثواب مترتب ہو سکتا ہے' تو رفیق محترم فیروز الدین صاحب رآزی حضرت تاثیر کے ساتھ برابر کے شریک ہیں' کیوں کہ تحقیق و تدقیق کی یہ کامیاب کوشش ان ہی کی تحریک و تشویق کا نتیجہ ہے۔ ومن یشفع شفاعۃً حسنۃً فلہ' نصیبٌ منھا۔ (مرتب)

وحی قرآنی کے متعلق جو بحث آج کل "نگار" اور "معارف" میں جاری ہے' وہ در اصل اسی پرانی بحث کا اعادہ ہے' جسے بنو عباس کے عہد میں فلاسفہ متکلمین اشاعرہ و معتزلہ اور متصوفین نے رواج دیا۔

فرق محض اتنا ہے کہ ان دنوں مسلمان علماء جملہ علوم متداولہ کے ماہر تھے اور اب نہیں۔ نہ صرف یہ کہ جب عربی و فارسی میں فلسفہ اور علوم طبیعی کی قریباً تمام متعارف کتابیں یونانی' شامی' نصرانی' عبرانی' سریانی اور ہندستانی ذرائع سے ترجمہ ہو چکی تھیں' بلکہ علوم میں جس قدر نئی تحقیقات ہوتی تھی' وہ اسلامی ممالک ہی میں ہوتی تھی۔ مسلمان صدیوں تک علوم مروّجہ میں مہذب دنیا کے راہ نما رہے اور یونانی فلسفہ جس پر آج یورپ اپنے فلسفے کا انحصار کرتا ہے' یورپ تک مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے پہنچا' مگر افسوس کہ بیشتر مسلمان

حکماء ارسطو وغیرہ کے غلط سلط تراجم اور تعبیرات پر اکتفا کر کے رہ گئے اور آج ہمارے دینی اداروں میں عموماً وہی پرانا آموختہ دُہرایا جا رہا ہے۔ ہمارے بیشتر علماء فلسفہ جدید اور علوم متعارفہ سے بڑی حد تک ناآشنا ہیں، اس لیے ان کا فرمودہ، فتاوے کے دائرہ سے باہر کہ وہ بھی بہت محدود ہے متقدمین کی سی استناد و وقعت نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کہ علمائے متقدمین ہمہ علم تھے اور ہمارے معاصر ہمہ جہل ہیں۔

تاریخ الحکماء (قفطی) میں منقول ہے کہ جب "پیر دست گیر" شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے فرزند ارجمند عبدالسلام الرکن پر تفلسف کا الزام لگایا گیا تو ان کی خانہ تلاشی پر بہت سی علم و حکمت کی کتابیں برآمد ہوئیں۔ "امیر المؤمنین" خلیفہ ناصر نے ان کتابوں کو بر سر بازار جلانے کا حکم دیا اور مشہور محدّث ابن المارستانیہ جو اپنے وقت کے بڑے خطیب اور شاہی طبیب تھے، انھوں نے کتابوں کے ڈھیر کے پاس ایک منبر استادہ کیا اور کتاب سوزی کے ساتھ وعظ سازی کی مجلس آراستہ کی حکیم یوسف کہتا ہے کہ ابن المارستانیہ نے ابن الہیثم کی مشہور تصنیف متعلقہ علم ہیئت کو ہاتھ میں لیا۔ چاروں طرف جھوم جھوم کے مجمع کو کتاب دکھائی اور یہ کہہ کر کہ یہ کتاب کفر و زندقہ کا مبدء و ماخذ ہے، اسے پہلے پُرزہ پُرزہ اور پھر نذرِ آتش کیا ——— اس رسم کے بعد عبدالسلام ابن عبدالقادر جیلانی رح کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔

غرض یہ رسم قدیم ہے۔ آج گو "علماء" کے ہاتھ میں نہ ریاست کی پیشوائی ہے اور نہ علم کی راہ نمائی ہے، مگر ان کی اشتعال پذیری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ بے بسی نے جھلاہٹ اور کھسیانے پن میں اضافہ کر دیا ہے

اور اقتصادی بے کاری نے انھیں آرائشِ دکان کی خاطر فروعات کی بحث کو اصول کی بحث سے بھی زیادہ فروغ دینے پر مجبور کر رکھا ہے ——— یہ مجبوری ریا و خلوص کی داخلی قدروں سے غیر متعلق ہے۔

دوسری طرف "نئی روشنی" کے خیرہ نظر "نوجوان" جاہلانہ علم فروشی میں غلو کر رہے ہیں اور سیاسی ادبار نے جو تندرست تفکر کا جائز حلقۂ عمل تنگ کر رکھا ہے۔ اس کا ردِ عمل مذہبی "آزادی" کی بے تقدیر نمائش میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ "نگار" کی سطحی تحقیق نمائی کی مقبولیت کا راز ان ہی حقائق میں پوشیدہ ہے۔

ایسے مباحث میں ہمیں اپنے سیاسی اور سماجی پس منظر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے عباسی دورِ حکومت میں معتزلہ جو زیادہ تر عجمی تھے، اُن کے ریاستی اقتدار کا باعث بھی سیاسی مفاد ہی تھا۔ عباسی سلاطین دیگر اہلِ قریش کو اپنا حریف سمجھتے تھے کہ وہ "ائمہ" ہونے کے "اہل" تھے اور حکامِ وقت کے ہم قوم تھے۔ اس لیے عباسیوں نے عجمیوں کو فروغ دیا اور "مذہبی آزادی" کو علمائے خیر کی طاقت کم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ بعینہٖ جس طرح مغلوں نے بابر کی وصیت کے مطابق راجپوت ہنود سے رشتہ ناطہ قائم کیا اور اپنے سیاسی حریف افغان مسلمانوں کو زیر کیا ——— اکبر کی مذہبی آزادی اور علماء سوٗ کی سرپرستی کا بھی یہی راز تھا اور آج ہمارے حکام نے مذہبی "آزادی" اور "رواداری" کو بھی اسی لیے روا کر رکھا ہے ——— ورنہ آزادی کے اور زیادہ ضروری مظاہر موجود ہیں۔

ہمیں "وحی" اور دیگر مذہبی معاملات پر بحث کرتے ہوئے اپنے گرد و پیش کے حالات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، تاکہ ہم اس مرض کی اچھی طرح تشخیص کر کے اس کا صحیح علاج کر سکیں۔ "نگار" کے مضامین کو ایک عام بیماری کی خفیف

علامات ہی تصور کرنا چاہیے۔

یہ واقعہ کہ مدیرِ "معارف" بالغ نظر عالمِ اجلّ ہیں اور مدیرِ "نگار" محض مدیر "نگار" ہیں۔ اس بحث کے نتائج اور عواقب پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ جہاں "جدید" تو یہ سمجھتے ہیں کہ "مولوی لوگ" حسب عادت "نئی روشنی" کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں "آزادی" کو دبا رہے ہیں اور جو یہ کہا جائے کہ مدیر "نگار" ابتدائی شدّت کو چھوڑ کر روحی کو پہلے محض "سوجھ بوجھ" کہ کر اب اپنے دعاوی کو کم زور کر کے لفظی ہیر پھیر میں ٹال مٹول کر رہا ہے، تو جواب ملتا ہے کہ یہ مصلحتی کتمان ہے اور "مولوی لوگوں" کی تخویف کا مزید ثبوت ہے۔

اس "سوءِ ظن" کے نفسیاتی مراحل کچھ اس طرح ہیں۔ علماء کا التباس "مولوی لوگوں" سے "مولویوں" کا مذہب سے کیا جاتا ہے اور اس طرح مذہب کو محض غیر معقول یا نامعقول ڈھکوسلوں کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔

جب دماغی حالت یہ ہے، تو نقلی دلائل سے تسلّی کی بجائے تنفر زیادہ ہوتا ہے ——— ضرورت اصل میں ایک نئے علم الکلام کی ہے، یا یوں کہیے کہ ایک نئی روش کی ہے۔ یہ درست ہے کہ موضوع جدال وہی پرانے ہیں، مگر اسلحہ بدل گئے ہیں۔ "نگار" کے پاس ترکش بھی کہنہ ہے اور تیر بھی زنگ خوردہ ہیں، مگر اس غوغائے متحارب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ خاموش متشکک ہیں، جو باطنی خلوص کے ساتھ عمیق غور و فکر کو کام میں لاتے ہیں۔

سرسیّد مرحوم کو لیجیے، انھوں نے حکمائے معتزلہ کا دستور اختیار کیا۔ ان کے مقابلے میں محض دشنام طرازی اور فتویٰ بازی سے کام لیا گیا۔ اشارہ کی سی خشت باری بھی نہ کی گئی۔ نشانہ پر تیر نہ مارا گیا اور جہاں معتزلۂ قدیم ظالم

تھے، اس جدید "معتزلی" کو مظلومیت کا درجہ نصیب ہوگیا—— یہ بھی نہ ہؤا کہ کوئی ابن رشد کی "فصل المقال" کا تتبع کرتا اور واضح کر دیتا کہ "ان الحکمۃ ھی صاحبۃ الشریعۃ والاخت الرضیعۃ" کسی نے بڑا تیر مارا، تو غزالی کی "تہافۃ الفلاسفہ" کا اندازِ رجم اختیار کر لیا۔

اسی وحی کی بحث ہی کو لیجیے!

موضوعِ بحث طریقۂ تنزیلِ قرآن ہے۔

جہاں تک عام دنیا کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ قرآن نام ہے چند معیّن معانی کا، جو ہمارے شعور تک ایک خاص ترتیبِ الفاظ و اصوات کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں۔

قرآن ایک موجود حقیقت ہے، اس سے فائدہ اٹھانا، راہ بری حاصل کرنا طریقۂ تنزیلِ قرآن کو سمجھے یا معیّن کیے بغیر بھی ممکن ہے۔ انھا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ۔ ان ھو الا ذکر للعلمین۔

اس لیے طریقۂ تنزیلِ قرآن کی بحث غیر افادی ہے، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غیر ضروری ہے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے کئی پہلو ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ

۱۔ "قرآن کسی خاص انسان سے منسوب نہیں ہے" اس کا فیصلہ کرنے کے لیے تاریخی اور اندرونی شواہد کی ضرورت ہوگی۔ دونوں قسم کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہمارے رسولِ پاک سے منسوب ہے۔ اور مدیر "نگار" کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

۲۔ قرآن رسولِ پاک کے نام سے منسوب تو ہے، مگر یہ کتاب محض ایک

اعلیٰ ادبی تصنیف ہے" جس طرح "شاہ نامہ" فردوسی کی تصنیف ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بے مثال ہیں۔ غالباً مدیر "نگار" کا یہ دعویٰ نہیں۔

۳۔ "قرآن پاک ایک بے مثال تصنیف ہے، اس لیے کہ اس کا مصنف بے مثال شخصیت کا مالک تھا۔" مگر اس کی تصنیف کا عمل وہی ہے، جو اس سے کم درجہ کی تصنیفوں کا بھی ہوتا ہے۔ اغلباً مدیر "نگار" یہی کہتا ہے۔

۴۔ قرآن پاک ایک غیر معمولی طریقے سے تصنیف ہوا ہے۔" یہ طریقہ عام عملِ تصنیف سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ شاید[1] مدیر "نگار" کا یہ عقیدہ ہو۔ گویا ہماری بحث کا مرکز "غیر معمولی عملِ تصنیف" ہے۔ ایسا عملِ تصنیف جو بنیادی طور پر عام عملِ تصنیف سے مختلف ہے! اس فقرہ میں "بنیادی" کا لفظ اہم ہے۔ (تصنیف سے مراد لفظی صورت اختیار کرنا ہے)۔

اگر یہ طریقہ بنیادی طور پر عام عملِ تصنیف سے مختلف نہیں، تو مدیر "نگار" اسے "وحی" کے لفظ سے تعبیر کیوں کرتا ہے؟ مگر اس نے "وحی" کے لفظ کی تشریح کچھ اس طرح کی ہے کہ اس عمل کا عام عملِ تصنیف سے بنیادی فرق واضح نہیں ہوتا۔ عام عملِ تصنیف کیا جبلت (یا طبیعت) سے بھی امتیاز نہیں ہوتا۔

انھوں نے پہلے تو لغوی معنوں پر بحث کی ہے اور "وحی" کو امام راغب اصفہانی کے حوالہ سے "اشارۂ سریعہ" بتایا ہے اور اس کا معمولی "سوجھ بوجھ" ترجمہ کر کے وحی کو مستقل طور پر "سوجھ بوجھ" قرار دیا ہے اور یہی بات محلِ بحث ہے۔

---

[1] "شاید" "غالباً" اور "اغلباً" کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ مدیر "نگار" اپنے بیانات جلد جلد بدلتا رہتا ہے ۱۲ (تاثیر)

اوّل تو امام راغب کی تعریف عام لغوی تعریف کی طرح اصلی معنی کی طرف محض اشارہ کرتی ہے۔ ایسے معنی بیان کرتی ہے، جو اصل لفظ کے لگ بھگ ہیں اور پھر اس کا "معمولی سوجھ بوجھ" ترجمہ کرنا صریح غلطی ہے۔ "اشارہ" سے مراد یونہی موہوم طور پر سمجھانا نہیں اور "سرعیہ" جو اصل لغت ہے، اس کو نظر انداز کر دینا بھی درست نہیں۔ ابن خلدون نے وضاحت سے لکھا ہے کہ "الوحی لغۃً الاسراع"۔ وحی کے معنی ہیں اسراع۔ کیوں کہ یہ عمل آنکھ جھپکنے میں سرعیًا ہوتا ہے۔ اس میں عام قیدِ زمانی نہیں ہوتی ——— اور اگر "سوجھ بوجھ" کو محض علمی لغزش بھی سمجھا جائے، تو لفظ "معمولی" کا اضافہ ایسی گم راہی ہے کہ اسے غیر ارادی تصور کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ غلطی نہیں مغالطہ آفرینی معلوم ہوتی ہے۔

مدیرِ "نگار" یہ کہہ سکتے تھے کہ میری دانست میں وحی کے معنی "معمولی سوجھ بوجھ" ہیں، مگر انھیں اس اپنی "معمولی سوجھ بوجھ" کو امام راغب سے منسوب کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔

لغوی معنوں کے بعد انھوں نے قرآن کی طرف رجوع کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ "وحی" کا لفظ جوں کہ "تنزیلِ قرآن" کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے اس لیے جہاں اسے قرآن کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، وہاں بھی اس سے مراد ویسا ہی عمل ہونا چاہیے۔

یہ اس طرح ہوا کہ اگر یہ کہا جائے کہ پانی چل رہا ہے اور یہ کہ انجن چل رہا ہے یا یہ کہ ہوا چل رہی ہے یا یہ کہ بھینس چل رہی ہے یا یہ کہ عورت چل رہی ہے تو ہر بار چلنے کے فعل سے (مثلاً) پاؤں سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنا ہی مراد لینا چاہیے، گویا "چلنا" سے مختلف تعبیرات کرنا غلط ہے۔

ظاہر ہے کہ محاورۂ زبان کی رو سے ایسا فرض کرنا غلط ہوگا۔ بھینس کا چلنا اور انجن کا چلنا بنیادی طور پر مختلف فعل ہیں۔

اسی طرح غیر اصطلاحی زبان میں ایک ہی لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "جذبہ" کا لفظ!

مسٹر نکلسن کا یہ طرز استدلال اس قدر غلط ہے کہ بہ آسانی یقین نہیں آتا کہ انھوں نے ایسا ہی کہا ہو۔ اگر انھوں نے محض اُمِ موسیٰ والی آیت کا حوالہ دیا ہوتا اور کہتے کہ چونکہ اُمِ موسیٰ کو نبوت حاصل نہیں تھی مگر ان کے لیے وحی کا لفظ استعمال ہوا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ رسول پاک کو جو وحی ہوتی تھی وہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہر انسان کو جو خیال سوجھے، وہ وحی ہے۔ رسول پاک کو بھی آیاتِ قرآن یونہی سوجھتی تھیں، تو اس سے شاید کچھ بات بن جاتی۔ اگر انھوں نے ارض کے متعلق "بان ربک اوحیٰ لھا" اور شہد کی مکھی کے متعلق "اوحیٰ ربک" کا حوالہ دے کر اپنی غلطی کو خود ہی فاش کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمادات اور حیوانات کو "وحی ہونا" "معمولی سوجھ بوجھ" کے معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا وحی کے معنی کی تعیین عبارت کے مطابق کرنی چاہیئے جس طرح ہماری زبان کے محاورے میں "چلنے" یا "جذبہ" کے الفاظ کی تعبیر کی جاتی ہے اور خود قرآنِ پاک میں رسول پاک کو آیات کی وحی ہونے کے متعلق اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ وہاں لفظ وحی کا استعمال صاف ہو جاتا ہے۔

سورۂ یونس میں آتا ہے: أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ کیا یہ اچنبھے کی بات ہے لوگوں کے لیے کہ ان میں سے ایک آدمی کی طرف ہم نے وحی کی؟ ـــــ اگر وحی محض "معمولی سوجھ بوجھ" ہوتی یا شہد کی مکھی

جبلت ہوتی، تو آں حضرتؐ کے ہم عصر اس پر اتنا تعجب کیوں کرتے؟ تعجب ہوتا، تو اس کے نہ ہونے پر ہوتا۔

تو پھر وحیِ قرآن کیا چیز ہے؟ —— یہ سوال مدیر "نگار" کی غلط منقولات سے غیر متعلق ہے، مگر ان خاموش متشککین کی خاطر جن کا دماغ "نگار" کی تحریروں سے اثر پذیر ہوتا ہے، اس کا جواب دینا ضروری ہے۔

قرآن میں وحی کا لفظ غیر عقلی ایجاب و شعور کے متعلق عام ہے (جس طرح "جذبہ" کا لفظ ہماری زبان میں مختلف ذہنی حالات پر اطلاق کرتا ہے)۔

چنانچہ جمادات و حیوانات (ارض و نحل) کی وحی کا بھی اور غیر نبی انسانوں (امِ موسیٰؑ) کی طرف وحی ہونے کا بھی ذکر ہے۔ وسوسۂ شیطانی کو بھی "وحی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور پیغمبروں کے پاس پیغامِ خدا کے پہنچنے کو بھی وحی کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ تمام عمل غیر عقلی اور انفعالی ہیں، مگر ان سب مظاہر میں بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے مختلف اصطلاحی الفاظ بھی وضع کیے گئے ہیں، جو عربی زبان کی لسانی ترقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ "نحل" کے غیر عقلی ایجاب کے لیے ابن حزم اور ابن خلدون نے "طبیعۃ" (جبلت) کا لفظ استعمال کیا ہے اور غیر نبی کے عام غیر عقلی شعور کو "وجدان" کہا جاتا ہے، مگر جب غیر نبی انسان کا غیر عقلی شعور حقیقتِ کائنات کی طرف رجوع کرے، تو اس کے لیے کشف و الہام وغیرہ کے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور نبی کے ایک خاص ورائے عقلی طور کو وحی کہا جاتا ہے۔

جس طرح شہد کی مکھی کی "طبیعۃ" عام انسان کی جبلت سے مختلف ہے، گو دونوں غیر عقلی ہیں۔ اسی طرح جبلت وجدان سے مختلف ہے۔ گو یہ تمام غیر عقلی

ظاہر ہیں۔ اگر میں شہد کی مکھی کے غیر عقلی شعور کا ذکر کروں اور اس کے بعد مدیر "نگار" کے غیر عقلی شعور کا ذکر کروں، تو میں راستی پر ہوں گا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ میں مکھی اور مدیر "نگار" کے شعور کو یکساں سمجھتا ہوں اور اگر میں مدیر "نگار" کے غصے کو غیر عقلی شعور قرار دوں اور ان کی شعر گوئی کو بھی غیر عقلی شعور قرار دوں، تو میں راستی پر ہوں گا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ میں ان کے غصے کو اور شعر گوئی کو ایک جیسا قرار دیتا ہوں ——

اسی طرح عام "وجدان" "الہام" سے مختلف ہے اور "الہام" "وحی" سے مختلف ہے!

انسان اور حیوان میں زندگی مشترک ہے اور ان کے چند غیر عقلی خواص میں بھی اشتراک ہے اور ایک عام انسان اور ولی اللہ میں انسانیت مشترک ہے اور چند غیر عقلی خواص کا بھی اشتراک ہے اور ولی اور نبی میں زندگی کے جملہ خواص مشترک ہیں اور ایک غیر عقلی شعور کائنات بھی مشترک ہے، مگر نبی میں ایک امتیازی خاصہ ہے، جسے ہم اصطلاحاً وحی کہتے ہیں! —— چنانچہ قرآن میں عام (غیر نبی) انسانوں اور نبی میں یہی ایک امتیاز بتایا گیا ہے —— اور چوں کہ قرآن میں وحی کا لفظ ہماری مروجہ اصطلاح کے مطابق مستعمل نہیں اس لیے اس امتیاز کو کئی طرح بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیم میں ہے: جب منکرین نبیوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری طرح انسان ہو۔ قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم۔ ہم تمھاری طرح انسان ہیں۔ ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ مگر یہ کہ ہم پر خاص امتنانِ ربی ہے! ——

سورۂ نحل میں ہے: وما ارسلنا من قبلک الا رجالاً نوحی الیھم۔ رسول پاک سے پہلے رسول بھی انسان تھے اور ان پر وحی ہوتی تھی ـــــ بس یہی ان کا امتیازی نشان تھا۔

سورۂ انبیاء میں پھر اسی بات پر زور دیا گیا ہے وما ارسلنا قبلک الا رجالاً نوحی الیھم اور خود رسول پاک کو فرمایا گیا ہے کہ کہو میں تمہاری طرح بشر ہوں، مگر مجھے وحی ہوتی ہے اور تمھیں نہیں ہوتی۔

اب سوچیے کہ نبی اور غیر نبی انسان میں جو امتیازی خاصہ ہے، وہ خاصہ جس کے علاوہ نبی ہر طرح عام انسانوں کی طرح ہے اور جس وصف کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے (یعنی وحی) اسے کس طرح عام سوجھ بوجھ یا شہد کی مکھی کی جبلت کہا جا سکتا ہے ـــــ؟

ظاہر ہے کہ قرآن پاک میں وحی قرآنی سے مراد "فطری ذہانت یا افتاد طبیعت" نہیں۔

اس "آزادی" کے زمانے میں "مدیر نگار" کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ میں قرآن پاک کی آیات کو اپنے لیے مستند نہیں سمجھتا، مگر وہ ایسا نہیں کہتا۔ وہ مختلف مضامین میں قرآن پاک کی رو سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وحی ایک معمولی یا غیر معمولی سوجھ بوجھ کا نام ہے۔

مگر جو متشکلین "مدیر نگار" کی حد بندی سے باہر نکل کر سوچنا چاہتے ہیں، ان کو بھی تنزیل قرآن اور وحی کی ماہیت کے متعلق غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ "ورائے عقل طور" غیر معمولی ہے، جو حیوانی جبلت اور شاعرانہ فکر سے مختلف ہے (وما ھو بقول شاعر . . . . تنزیل من رب العلمین)۔

وحی قرآنی کو سمجھنے کے لیے ہمیں وہی طریقۂ تحقیق اختیار کرنا چاہیے، جو ہم تجربی مظاہر کے متعلق استعمال کرتے ہیں، یعنی، سائنس کا استقرائی طریقہ! ——— اور چوں کہ ہم خود اس عمل کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، اس لیے ہمیں دوسروں کے مشاہدات سے نتائج مرتب کرنے پڑیں گے۔

پہلے خود رسولِ پاک کے اپنے بیانات لیجیے: (میں قرآن کے حوالے نہیں دیتا، کیوں کہ وہ تو خود معرضِ بحث میں ہے) "کبھی وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے (صلصلۃ الجرس) اور یہ بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کے گذر جانے کے بعد جو کہا جاتا ہے، مجھے یاد رہتا ہے۔ ۔ ۔" (دیکھیے بخاری "بدء الوحی" اور "بدء الخلق"، مسلم "فضائل"، ترمذی "مناقب"، نسائی "افتتاح"، موطا، امام مالک رح "باب الوضوء لمن مس القرآن" اور مسند امام حنبل، بار ششم) عبد اللہ بن عمر نے رسولِ پاک سے پوچھا کہ آپ کو وحی کس طرح آتی ہے؟ فرمایا کہ جیسے تاشے بج رہے ہوں۔ نسائی میں سورۂ "مومنون" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وحی کے آنے پر شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی سی آواز آتی تھی۔

پھر ان لوگوں کے مشاہدات کو لیجیے، جنھوں نے آپ کو وحی کی حالت میں دیکھا۔ سب سے پہلے حضرت عائشہ رض کی شہادت ہے کہ لقد رایتہ ینزل علیہ الوحی فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنہ وان جبینہ لیتفصد عرقاً۔ (مسلم و بخاری) سخت سردی کے دن پسینہ چھوٹ جاتا۔

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ وحی کی حالت میں کرب کذلک و تربد وجہہ سخت بے چین ہوتے اور چہرہ غبار آلود ہو جاتا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ سر جھکا لیتے۔ ایک اور مشاہدہ ہے کہ تربد لہ وجہہ، چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

(مسلم صفحہ) احمد بن حنبل کی روایت ہے کہ تربد جلدہ (
ایک روایت میں ہے کہ تربد لذلک جسدہ و وجہہ
مؤطا ہی میں ایک روایت عثمان بن مظعون کی ہے کہ انھوں نے رسولؐ پاک کو وحی کی حالت میں غور سے کچھ سنتے ہوئے دیکھا۔
زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ وحی آئی تو رسولؐ پاک کی گردن کا حصہ میرے زانو پر پڑا کہ مجھے احتمال ہوا کہ میری ران کی ہڈی ٹوٹ جائے گی ——————

——————

غرض اس طرح کی اور بہت سی روایتیں ہیں۔ ان عینی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا عمل عام عقلی یا غیر عقلی مظاہر دماغی سے مختلف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان تمام مظاہر میں ایک "انفعالیت" نظر آتی ہے۔ یعنی ایک ہی حقیقت کو قبول کر رہا ہے۔ اپنا ارادہ بروئے کار نہیں لا رہا ———— یہی وہ انفعالی حالت ہے، جو قرآن میں "وحی" کے ساتھ مختص ہے۔ جمادات، حیوانات، عام انسان اور نبی کی وحی میں یہ انفعالی حالت، یہ بے ارادگی مشترک ہے۔ اس کی انفعالی حالت ظاہر ہے۔ "نحل" کا چھتہ بنانا اور وہ اعمال جو نتیجہ وحی ہیں، کبھی بے ارادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ام موسیٰؑ کو اپنے ارادے کے بغیر ورائے عقل ہدایت ہوئی تو اسے بھی وحی کہا گیا اور رسولؐ پاک کو جو پیغام ہدایت آیا کیونکہ وہ بھی ان کے اپنے ارادے سے نہیں آیا، اس لیے اُسے وحی کہا گیا۔
عمل وحی کے روایت کردہ مظاہر سے بھی یہی "انفعالیت" نمایاں ہوتی ہے! ——————

ان مظاہرات کے متعلق دو طرح کے اعتراض ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ

روایات غیر معتبر ہیں، مگر یہ بات ماننے کے لیے وجوہ درکار ہیں۔ ہم عام مظاہر کے متعلق اس سے کم درجہ معتبر روایات و مشاہدات پر اعتبار کر لیتے ہیں اور اگر ایسے معتبر یعنی شواہد پر یقین نہیں کرتے، تو پھر تاریخ کے اکثر واقعات، بلکہ ہر روایتی واقعہ سے انکار کرنا پڑے گا اور فقط اپنے (چشم دید) مشاہدے ہی کو قابلِ وثوق گرداننا پڑے گا۔

اعتراض کا دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے: کہا جائے کہ یہ غیر معمولی جسمانی مظاہر واقعاتی ہیں، مگر یہ تو علاماتِ جنون ہیں اور یہ اعتراض نیا نہیں رسولِ پاک کے ہم عصر کفار نے یہی کہا اور آج کل کے کئی عیسائی معترضین بھی یہی کہتے ہیں اور خود عیسائی صالحین کے متعلق چند عیسائی حکماء نے بھی یہی کہا ہے ——— ان مظاہر کو مرگی، صرع وغیرہ کا دورہ کہا ہے! ———

——— قرآن اس الزام کو دہرا کر اس کی واضح تردید کرتا ہے:

سورۂ قلم: ما انت بنعمۃ ربک بمجنون۔ بفضلِ خدا تو مجنون نہیں۔

سورۂ تکویر: وما صاحبکم بمجنون۔ (رسولِ پاک) دیوانے نہیں۔

سورۂ اعراف: وما بصاحبہم من جنۃٍ (رسولِ پاک) کو دورے نہیں پڑتے۔

اور یہ محض بیانیہ تردید نہیں۔ قرآن کا استدلال قطعی طور پر مسکت ہے۔ سورۂ قلم میں وضاحت کر دی ہے کہ اے رسولِ ما! تو بفضلِ خدا مجنون نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انک لعلیٰ خلق عظیم۔ (تجھے خلقِ عظیم حاصل ہے) اور وحیٔ قرآنی کی صداقت کا بہترین ثبوت بھی یہی ہے۔ جس طرح وحی کے جسمانی مظاہر بعد جن کی بنا پر کفار نے رسولِ کریم پر جنون کی تہمت لگائی تھی۔ آپؐ کے خلق

اور عام کردار کی عظمت کا برقرار رہنا اس تہمت کو غلط ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح وحی کے بعد جو پیغام آپ لوگوں کو سناتے تھے، وہ وحی کی صداقت پر دلیل ہے۔

وحی تو تنزیلِ قرآن کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کے وقیع ہونے کا ثبوت وہ تعلیم ہے، جو وحی کے ذریعے سے ہم تک پہنچی اور اس تعلیم کی خوبی کی پرکھ اس کے عاملِ کامل کے کردار سے ہوتی ہے۔

مگر تعلیمِ قرآنی کی قدر و منزلت کا مسئلہ ہماری موجودہ استقرائی تحقیقات سے غیر متعلق ہے۔ ہم اب تک وحی کی نفسیاتی کیفیت اور اس کے جسمانی مظاہر پر بحث کر رہے تھے اور سائنس کے مروّجہ اصولوں کے مطابق ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وحی ایک غیر معمولی اور وقیع مظہرِ شعوری ہے، جو نہ عام ذکاوت، نہ شاعرانہ فکر اور نہ مجنونانہ دورہ ہے۔

یہاں علمِ نفسیات کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، کیوں کہ اس علم کا منصب استقرائی طریقے سے مظاہرِ شعوری کا محض تجزیہ کرنا ہے، اس کی قدریں مقرر کرنا نہیں۔

زندگی میں وحی کی کیا قدر ہے؟ یہ فلسفہ یا مابعد الطبیعات کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے وحی کے اختصاص کی ضرورت نہیں۔ اس بحث میں جملہ ورائے عقل اطوار کی جانچ تول شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادراکِ حقیقت محض حواس و عقل سے ہو سکتا ہے یا ورائے عقل اطوار، الہام، مکاشفہ، وحی وغیرہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ڈرک ہائیم اور ونڈٹ تو کہتے ہیں کہ کسی مذہب کی پرکھ، محض ان خارجی اثرات کے مشاہدہ سے ہونی چاہیئے، جو اس کی تعلیم سے کسی جماعت پر پڑتے ہیں اور اس طرح وحی قرآنی کی پرکھ رسولِ پاک کی زندگی

(حضرت عائشہ رضؓ نے آپ کو زندہ قرآن کہا ہے) صحابہ کرام رضؓ کے عمل اور اسلامی سوسائٹی کے اوصاف سے ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال رحؒ کا بھی یہی اصول تھا۔ مگر لیوبا کا یہ قول بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذہب ایک شعوری حالت کا نام ہے۔ اس لیے وحی (جو تنزیلِ قرآن کا ذریعہ ہے اور قرآن ہمارے مذہب کی ابتداء و انتہا ہے) کی قدر کو جانچنا بھی ضروری ہے۔

میں اس سلسلے میں مشہور فلسفی ہوکنگ اور ولیم جیمز کے دلائل کا اعادہ کر دیتا ہوں۔ حواس اور عقل کا عمل محض ایک ذریعۂ شعور ہے اور جن شواہد کی بنا پر ہم اس کو مؤثر سمجھتے ہیں، ان ہی کی بنا پر ذوقی تجربہ یا مشاہدۂ حق کو بھی مؤثر سمجھنا چاہیے۔ حقیقت تک پہنچنے کے یہ دو مختلف راستے ہیں۔ صوفی بھی بلاواسطہ چند واقعات کا ادراک کرتا ہے اور عام آدمی بھی۔ ایک کا ذریعہ ذوقی تجربہ ہے اور دوسرے کا حواس! مختلف واقعات ہیں اور مختلف ذرائع ادراک! ——

"گاڑی کھڑی ہے" —— یہ ایک واقعہ ہے، جس کا ہونا حواس سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ حواس نہ ہوں، تو یہ واقعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر حسِ ذائقہ نہ ہو تو کسی چیز کا مزا کسی اور طرح بتایا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح "ذاتی تجربہ" خدا کے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ اس ذوق کے بغیر اس کا احساس کرانا غیر ممکن ہے۔ لہٰذا ہم مشاہدۂ حسی اور مشاہدۂ ذوقی دونوں کو صحیح مانتے ہیں! —— اور جس طرح حواس کو مغالطہ ہوتا ہے، اسی طرح ذوق کو بھی مغالطہ ہو سکتا ہے۔

اور باقی رہا عقلی استدلال، سو اس کا کام واقعات کو حسبِ منشاء توڑنا موڑنا ہے۔ عقلی ادراک کی ناکامی اور نامرادی کا اقرار واقعی ثبوت کانٹ کی "تنقیدِ تعقل" سے ملتا ہے! ——

اور ادراکِ غیر عقلی کا ثبوت ہزاروں اولیاء کے ذوقی مشاہدات سے ملتا ہے، یہ اولیاء دنیا کے دیگر امور میں صاحب تدبیر و ہمت تھے۔ یوں ہی مست قلندر نہ تھے۔ (انبیاء کا درجہ تو خیر بہت بلند ہے) اس پر یہ اعتراض کہ سائنس کے تجربات و نظریات کی طرح ان ذوقی تجربات و مشاہدات کو عام انسان آزما نہیں سکتے، کچھ ایسا وزنی نہیں۔ اول تو سائنس کے تجربات کو عام آدمی آزمانا کیا ہمیشہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیات کو دنیا میں شائد چھ سات آدمی اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں، مگر اسے مسلّماتِ سائنس ہی میں جگہ دے دی گئی اور پھر سائنس کے تجربات کو آزمانا در کنار دہرانا بھی آسان نہیں۔

یہاں میں برگساں کی دی ہوئی ایک مثال کو دہراتا ہوں۔ جب اندرونِ افریقہ نامعلوم تھا۔ جغرافیہ والے کسی ایک معتبر سیاح کے بیان کردہ واقعات کو مان لیتے تھے تو کسی سٹون کی سیاحت کا راستہ مدتوں نقشوں اور اٹلسوں پر نظر آتا رہا —— آج کل شمالی اور جنوبی قطب کی زمینوں کا یہی حال ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان راستوں پر اور لوگ بھی چل سکتے تھے۔ یہ بجا ہے مگر دنیائے ماورائے عقل کے سیاحوں کے راستوں پر بھی اور لوگ چل سکتے ہیں۔ ان راستوں پر ایک نہیں، دو نہیں، سینکڑوں اولیاء اور انبیاء چلے اور ان کے نقشوں کو غیر معتبر کہنا کہاں کی دانش مندی اور سائنس دانی ہے؟ ——

میں نے اولیاء اور انبیاء کا نام اکٹھا لے دیا۔ تجربۂ ذوقی کے سلسلے میں! —— جس طرح امام غزالی نے "المنقذ عن الضلال" میں لکھا ہے: من لم یذق منہ شیئًا بالذوق فلیس یدرك من حقیقۃ النبوۃ الا الاسم مگر اولیاء کے تجربۂ ذوقی اور انبیاء کے تجربۂ ذوقی میں بہت فرق ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی رح ان میں قریبًا بنیادی فرق بتاتے ہیں: "ولایت اولیاء اقربیت را نہ شناسد و جہالت را نداند کہ کدام ست"۔ یعنی 'اولیاء کو مغالطۂ ذوقی ہو سکتا ہے اور انبیاء کو نہیں ہوتا۔

اس کی توضیح صاف ابن صیاد کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ علم نفسیات کے شوق رکھنے والے حضرات کو یہ واقعہ نتیجہ خیز معلوم ہوگا۔ ابن خلدون اور علامہ اقبال دونوں نے اس سے خاص معنی اخذ کیے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ رسول پاک بنو مغالہ (مغالہ) کے ایک بارہ سالہ بچے کو دیکھنے گئے' کیوں کہ اس کے متعلق غیر معمولی روایات مشہور تھیں۔ عبداللہ بن عمرؓ آپؐ کے ساتھ تھے اور وہی اس کے راوی ہیں[۵]۔ آپؐ نے اس بچے سے (جس کا نام صاف ابن صیاد تھا) پوچھا کہ میں ایک بات دل میں رکھ کر تم سے پوچھتا ہوں اور دل میں یہ آیت رکھ لی: یوم تاتی السماء بدخان مبین۔ ابن صیاد نے کہا کہ ھو الدخ "دھواں ہے" آپؐ نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ تو کیا دیکھتا ہے؟ تو اس نے کہا "یاتینی صادق و کاذب" سچ جھوٹ دونوں۔ رسول پاک نے اس کی خیال بینی اور اشراقی قوت کا مشاہدہ کر کے یہ رائے دی کہ "لبس علیہ" اس کو وہم والتباس ہوتا ہے حقیقت اس پر واضح نہیں۔ یہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ وہ کہانت ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے اور کفار نے نبوت کو اسی کہانت سے ملتبس کرنے کی کوشش کی۔ (ولا بقول کاھن)۔

آج کل بھی نفسیات کے چند ماہر ولایت اور نبوت کو کہانت اور صرع سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ غیر علمی بے تمیزی ہے۔

---

[۵] مسلم اور بخاری دونوں میں یہ حدیث درج ہے اور مشکوٰۃ میں منقول ہے ۱۲ منہ

صرع وجنون عوارضِ دماغی ہیں۔ کہانت، خیال بینی اور داخلی ذہنی طاقتوں کی نمائش ہے ولایت انفرادی اور نامکمل مشاہدۂ حق ہے اور نبوت مکمل مشاہدہ و ترجمانیٔ حق ہے!

اور نبوت کا بنیادی مابہ الامتیاز "وحی" ہے ——— ایجابِ پیغامِ حق کی صلاحیت اور اس کے بیان کی قوت! ——— وحی ایجاب و بیان دونوں پر حاوی ہے اور یہ تشریح ہے لفظِ "قل" کی جو بار بار آیاتِ قرآنی میں آتا ہے۔

ایجابِ پیغام سے محض ذاتی روحانی فائدہ ہو سکتا ہے، مگر بیانِ پیغام سے سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہی وہ ذمہ داری تھی جس کے احساس سے آپ ابتدائے وحی میں کہتے تھے: "لقد خشیت علیٰ نفسی" (مجھے اپنے متعلق ڈر لگتا ہے) اور جس کے متعلق ورقہ بن نوفل عمِ خدیجہ رضؓ نے کہا تھا: لم یات رجلٌ قط بمثل ما جئت بہ الا عُودِیَ (جب کوئی اس جیسا پیغام لایا، لوگ اس کے دشمن بن گئے) ———

غرض وحی ایک غیر معمولی ورائے عقل ذریعۂ ایجاب و بیانِ پیغامِ حق ہے جس کی اہمیت اور صداقت قرآن، حدیث، نفسیات اور فلسفہ کے اصولوں سے ثابت ہوتی ہے! ———

آخر میں علماء کرام سے استدعا ہے کہ وہ السوال بدعۃ کے مسلک کو چھوڑ کر لاتغلوا فی دینکم پر عمل پیرا ہوں اور "نئی روشنی" کے مشعل برداروں سے درخواست ہے کہ وہ یورپ کے ہر مصنف کو ملہمِ ربانی ماننے سے پہلے اسے اسی طرح جانچیں جس طرح وہ اپنے علماء کے اقوال اور مذہبی تعلیمات کو جانچنا چاہتے ہیں۔ انّ خیرالامور اوسطھا۔

باقی رہا "مدیر نگار" سو وہ "مدیر نگار" ہے۔ علیہ ماعلیہ!

"نگار" کا طرزِ دل فگار

(جناب مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری مدیر اہلحدیث)

"کلام خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے۔ خدا نے علیٰ وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کیے، جنھیں اپنی زبان میں آپ نے لوگوں پر پیش کر دیا"

("نگار" اگست صفحہ)

ناظرین کرام! اس اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی الفاظ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وغیرہ من اللہ نہیں، بلکہ اس کا مضمون آں حضرت صلعم کے قلب مبارک پر نازل ہوا، جسے آپ نے اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔ اسلام کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہیں ہے۔ ایڈیٹر صاحب "نگار" شاکی ہیں کہ ہمارے جواب میں دلائل عقلیہ یا تصریحاتِ قرآنیہ پیش نہیں کی جاتیں۔ بلکہ روایات اور اقوال الرجال پر زور دیا جاتا ہے، جن کے ہم قائل نہیں ہیں۔

ہم ان کے اس مطالبہ کی قدر کرتے ہوئے قرآن ہی سے جواب دیتے ہیں، مگر جواب دینے سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر صاحب "نگار" نے دراصل سرسید احمد مرحوم علی گڑھی کی تفسیر القرآن جلد اوّل سے یہ خیال اخذ کیا ہے جس کی اطلاع بہت کم لوگوں کو ہوگی، بلکہ سرسید مرحوم کے الفاظ میں مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ سختی اور تلخی ہے۔ سر موصوف نے حقیقتِ جبرئیل ؑ

اور ملکۂ نبوّت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح ایک پاگل آدمی اپنے خیال میں کسی کو مخاطب کر کے گفت و گو کرتا ہے، اسی طرح نبی اور رسول اپنے عالمِ خیال میں جبرئیل کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور اس کی بات سُنتا ہے، حقیقت میں اس کا اپنا ہی فطری ملکہ ہوتا ہے، جو فوّارے کی طرح اسی سے نکلتا ہے اور اسی پر گرتا ہے۔

خیر یہ تو مرشد جانے یا مسترشد جانے، ہم تو یہی کہیں گے: لیس ھٰذا باول قارورۃٍ کسرت فی الاسلام (یہ پہلا ہی صدمہ نہیں ہے، جو اسلام کو پہنچا ہے)۔

چوں کہ ایڈیٹر صاحب "نگار" نے قرآن مجید سے دلیل طلب کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آپ خود بھی قرآن مجید سے اپنے دعوے پر دلیل پیش کر کے مخالفین سے اس کے جواب کا تقاضا کرتے، لیکن اگر انھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، تو ہم اپنے فرض سے کیوں قاصر رہیں؟ کلام اللہ کا بیان سُنیئے! ارشاد ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

اس آیت میں لفظ قَرَاْنٰهُ سے ہمارا استدلال ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ قرآن سنتے ہوئے اُسے جلد پڑھ لینے کی خاطر اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کریں۔ تحقیق ہمارے ذمّے ہے اس کو جمع کرنا اور تم کو پڑھا دینا۔ جب ہم اس کو پڑھا کریں، تو ہماری قرأت کی اتباع کیا کرو۔

اس فعل قَرَاْنَا کا فاعل یقیناً جبرئیل ہے جس طرح آیت يُجَادِلُنَا فِيْ

فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ (پ ۱۲ ع ۱) میں ضمیر منصوب سے مراد فرشتے ہیں، جنھوں نے کہا تھا کہ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں اُن سے فرمایا: اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا (پ ۱۲ ع ۱) یعنی اس بستی میں تو حضرت لوطؑ بھی ہیں، کیا اس کو بھی ہلاک کر دو گے؟ تو فرشتوں نے جواب دیا: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا، یعنی ہم خوب جانتے ہیں کہ اس بستی میں کون لوگ ہیں۔ اس آیت کی شہادت سے معلوم ہوا کہ فعل قَرَأَهُ کا فاعل بہ ذریعہ ملائکہ خدا تعالیٰ ہے اور ضمیر منصوب قرآن کی طرف راجع ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جبرئیل جو پڑھتا تھا، وہ خدا کے بتلائے ہوئے الفاظ پڑھتا تھا۔ اور وہی آں حضرت صلعم کی سمع مبارک میں مسموع ہوتے تھے اور انھی الفاظ کو آپ بہ حکم آیت مندرجہ ذیل اپنی اُمّت تک پہنچاتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (پ ۶ ع ۱۴)	اے رسول! تمھارے رب کی طرف سے تمھاری جانب جو کچھ نازل کیا گیا، اُسے لوگوں تک پہنچا دو

اسی کی تائید میں فرمایا: لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ (پ ۲۹ ع ۶) اس آیت میں تَقَوَّلَ کو فعل کی صورت میں اور بعض الاقاویل کو مفعول کی صورت میں جمع کر کے بیان کرنا بھی اسی مطلب کی تائید کرتا ہے کہ قول بالقرآن جبرئیلؑ کے ذریعہ سے خدا کی طرف سے تھا، نہ کہ رسولؐ کے اپنے الفاظ میں۔ اس تشریح سے ایک اور آیت کے معنی بھی حل ہو جاتے ہیں، جس میں ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ (پ ۳۰ ع ۶) اس آیت میں قول کو رسول کریم کی طرف اضافت کیا ہے، ذات محمد (صلعم) کی طرف نہیں، یعنی یہ نہیں کہا:

لہ ابراہیمؑ ہم (خدا) سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا ۱۲ منہ

اِنَّهٗ لَقَوْلُ مُحَمَّدٍ، کیوں کہ رسول بحیثیت رسالت کے جو کچھ کہتا ہے، وہ اس کے بھیجنے والے کا پیغام ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کا اپنا کلام۔ پس ثابت ہوا کہ موجودہ قرآن مجید کے الفاظ وہی ہیں جن کو جبرئیل نے خدا سے سُن کر آں حضرت صلعم کے سمع مبارک تک پہنچا دیا اور جن کو آپ نے اسی طرح پڑھا پڑھایا، جس طرح جبرئیل سے سُنا تھا۔ ہمارے دعوے کی مزید تائید سورہ جن کی آخری آیت سے بھی ہوتی ہے، مگر ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے لعل فیہ کفایۃ لمن لہ درایۃ۔

قرآن بحیثیت کلام الرحمٰن

"نیاز" کے مغالطوں کا جواب

(جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان")

قرآن پاک کے "کلام الٰہی" اور "الہام ربانی" ہونے سے "بے باکانہ" انکار کرنے والے نیاز فتح پوری نے اگست کے "نگار" میں خلط مبحث کرکے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے یا مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی جو پُر فریب کوشش کی ہے، اس کا ذکر "الفرقان" کی اس سے پہلی اشاعت میں کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں جو دس سوالات یا "شبہات" انھوں نے پیش کیے ہیں، آج کی صحبت میں حسب وعدہ ان کا جواب ہمیں عرض کرنا ہے۔

عرض جواب سے پہلے ہم یہ پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ نیاز صاحب پر ملت کی طرف سے جو جرم قائم ہے، وہ یہ ہے:

(الف) وہ ادعاء اسلام کے باوجود قرآن پاک کے "کلام الٰہی" اور "الہام ربانی" ہونے کے منکر ہیں۔

(ب) قرآن پاک کو وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تالیف کردہ کلام اور آپ ؐ کی فہم و فراست کا نتیجہ کہتے ہیں۔

(ج) قرآن پاک میں اُمم ماضیہ کے جو واقعات اور قصص مذکور ہیں، وہ اُن کی حتی صحت کے قائل نہیں بلکہ اُن کا خیال ہے کہ اُس زمانہ کے یہود و نصاریٰ یہ

قصّے تورات و انجیل سے بیان کیا کرتے تھے۔ (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن ہی سے سُن سُنا کر بلا تحقیق و تنقیح ان کو قرآن میں درج کر دیا ہے۔ اب قرآن میں اُن کا درج ہونا اُن کی صحّت و واقعیّت کا ضامن نہیں۔

یہ ہیں نیاز صاحب کے وہ "کافرانہ ہفوات" جو اُنھوں نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ جون کے "نگار" میں درج کیے اور اُنھیں کی بنا پر ہم نے اُن کو "مرتد" یا "منافق" لکھا اور اُن کی یہی خرافات ہیں ملّت کے نزدیک اُن کا اصل جُرم!

اس کے بعد اُنھوں نے اگست کے "نگار" میں جس نئے انداز سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے اور قرآن کے قدم و حدوث کی بحث کے دامن میں پناہ لینے کی جو کوشش کی ہے اور اپنے "شبہات" پیش کر کے مسلمانوں کو اپنی "معذوری" اور "معصومیت" کا جو یقین دلانا چاہا ہے، ہمارے نزدیک وہ صرف ایک مُزدلانہ چال ہے، جس کا تجربہ اپنے متعلق ہم کو وہ پہلے بھی کرا چکے ہیں، اس لیے ہمیں یہ توقع تو نہیں کہ ہماری یہ خامہ فرسائی اُن کے دلی روگ کو دُور کر سکے گی۔ ہاں یہ امید ضرور ہے کہ اُن کے ان شبہات اور مغالطات نے جن اَور بہت سے مذہب سے ناواقف سادہ لوحوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے ہوں گے، اِن شاء اللہ وہ ہمارے اِس جواب سے اطمینان حاصل کر سکیں گے اور درحقیقت وہی طبقہ اِس وقت ہمارا مخاطب ہے۔ وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

نیاز صاحب کے پیش کردہ "شبہات" یا مغالطات کا جواب شروع کرنے سے پہلے حق تعالیٰ کی "صفتِ کلام" اور "کلامِ پاک" کے متعلق، بہ طور تمہید چند

اصولی باتیں عرض کر دینا ضروری ہیں، جن کے بعد اس بحث کو سمجھنا ہر ایک کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ آسان ہو جائے گا۔ اس تمہیدی گذارش کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمایا جائے!

تمہید | یہ تو ظاہر ہے کہ صفتِ کلام کے لحاظ سے خود انسان میں تین حیثیتیں نمایاں ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ اس میں "قوتِ ناطقہ" یعنی گویائی کی صلاحیت اور قابلیت ہے اور اسی حیثیت سے اس کو "حیوانِ ناطق" کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے، تو تکلم اور تلفظ سے پہلے اس کے ذہن میں ایک مطلب اور مضمون ہوتا ہے، جس کو وہ بعد میں الفاظ سے ادا کرتا ہے۔

۳۔ تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ نطق اور تلفظ کے ذریعے اپنے اس مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ بلا تشبیہ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی "صفتِ کلام" میں بھی تین حیثیتیں اور تین درجے ہیں۔

پہلے درجہ کو بمنزلہ[1] "قوتِ تکلم" کے سمجھنا چاہیے (اور علمی اصطلاح میں اس کو "مبدأ تکلم" اور "منشاء صدورِ کلام" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس طرح کہ علم کو مبداء انکشاف کہا جاتا ہے)۔

تو حق تعالیٰ کی "صفت کلام" کا یہ پہلا درجہ علم اور قدرت وغیرہ کی طرح قدیم

---

[1] "بمنزلہ" کا لفظ اس لیے لکھا گیا ہے کہ فی الحقیقت اس درجہ کو "قوتِ تکلم" سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اس کی صحیح تعبیر "مبدأ تکلم" اور "منشاء صدورِ کلام" ہی سے ہو سکتی ہے ۱۲

اور ازلی ہے اور اس کی صفاتِ حقیقیہ میں سے ہے، جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور اس کا مشہور اصطلاحی نام "کلام نفسی" ہے۔

دوسرا درجہ وہ مفصّل مطالب اور مضامین ہیں، جن کو الفاظ و حروف سے ادا کیا جاتا ہے اور جو کلام لفظی کا مدلول ہوتے ہیں، تو حق تعالےٰ میں بھی اس کی شانِ رفیع کے مطابق یہ درجہ موجود ہے اور اس کو بھی "کلامِ نفسی" کہا جاتا ہے اور یہ بھی قدیم ہے۔

تیسرا درجہ اُن مرتب الفاظ و عبارات اور حروف و کلمات کا ہے، جن سے مضمون و مقصود ادا کیا جاتا ہے اور اس درجہ کا اصطلاحی نام "کلام لفظی" ہے اور اس حیثیت سے جب کسی کلام کو "کلامِ الٰہی" کہا جاتا ہے، تو اس کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی مرضی و منشاء اور اپنے احکام بندوں کے علم میں لانے کے لیے خود اس کلام کی تالیف و تنزیل فرمائی ہے، لیکن اس "کلام" کے ظہور کا محل عموماً کوئی شے مخلوق ہی ہوتی ہے، مثلاً حق تعالیٰ اپنے اس کلام لفظی کو اپنی قدرت کے ذریعے حاملِ وحی فرشتہ کی زبان پر جاری فرما دیتا ہے یا اس پر دلالت کرنے والے نقوش لوحِ محفوظ میں منتقش فرما دیتا ہے یا رسول کے قلب میں اپنے اُس مؤلّف کلام کا القا فرما دیتا ہے اور پھر وہ رسول ان ہی الہام شدہ الفاظ و عبارات میں اس کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور لوگوں کو سُناتا ہے ——— یہ تیسرا درجہ جس کا اصطلاحی نام "کلام لفظی" ہے، اپنے وجود خارجی کے لحاظ سے حادث و مخلوق ہے (خواہ وہ وجود خارجی لوحِ محفوظ میں نقوش کی شکل میں ہو یا رسول یا فرشتہ کی زبان پر الفاظ و حروف کی صورت میں ہو) پھر یہ "کلامِ لفظی" "کلامِ نفسی" درجہ اوّل کے آثار میں سے ہوتا ہے اور درجہ دوم اس کا مدلول اور معبّر عنہ

ہوتا ہے۔ اگر یہ تینوں درجے اور ان کا باہمی فرق آپ کے ذہن نشین ہو چکے ہیں، تو اسی جگہ اہل سنّت اور معتزلہ کے اختلاف کی حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے کیونکہ اس بارہ میں عام طور پر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ معتزلہ کا خلاف در اصل صرف یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی "صفتِ کلام" کے پہلے درجہ کے منکر ہیں، یعنی ان کو اس سے انکار ہے کہ علم و قدرت وغیرہ کی طرح حق تعالیٰ کی کوئی مستقل ازلی صفت "کلام" یا "تکلم" ہو ـــــ دوسرے درجہ کو وہ صرف بہ ضمن "علم" تسلیم کرتے ہیں۔ غرض وہ "کلام نفسی" کے وجود ہی سے انکاری ہیں ـــــ البتہ "کلامِ لفظی" کے وہ قائل ہیں اور اسی کے لحاظ سے حق تعالیٰ کو متکلم اور قرآن پاک کو "کلامِ الٰہی" کہتے ہیں۔ پس "کلامِ لفظی" تو ہر دو فریق کے نزدیک مسلّم ہے اور "کلامِ نفسی" جو اہل سنّت کے نزدیک قدیم اور ازلی صفت ہے، اس سے معتزلہ کو انکار ہے۔ پس معتزلہ جو کلامِ الٰہی کو مخلوق کہتے ہیں، تو اس کا منشاء یہ ہے کہ اُن کے نزدیک "کلامِ الٰہی" صرف "کلامِ لفظی" میں منحصر ہے اور وہ مخلوق ہے اور اہلِ سُنّت کے نزدیک کلامِ الٰہی کا اوّلی مصداق چوں کہ کلامِ نفسی ہے اور وہ قدیم ہے، اس لیے وہ کلامِ الٰہی کو قدیم کہتے ہیں، تو اصل اختلاف "کلامِ نفسی" کی نفی و اثبات کا ہے اور وہی حقیقی محلِ نزاع ہے، ورنہ "کلامِ لفظی" جو اصوات و حروف سے مرکّب ہوتا ہے، اس کا حادث ہونا خود اہلِ سُنّت کو بھی مسلّم ہے۔

اور یہ جو کچھ عرض کیا گیا، ہمارا اپنا خیال نہیں، بلکہ کتبِ کلام میں پوری تشریح اور توضیح کے ساتھ مذکور ہے۔ چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

علمِ کلام کی مشہور کتاب "مواقف" میں بیانِ اختلاف کے بعد فرمایا:

"اذا عرفت هذا فاعلم ان ما يقوله المعتزلة وهو خلق الاصوات والحروف وكونها حادثة قائمة فنحن نقول به ولا نزاع بيننا وبينهم في ذلك وما نقوله من كلام النفس فهم ينكرون ثبوته ولو سلموه لم ينفوا قدمه فصار محل النزاع نفي المعنى واثباته"

اور محقق دوانی "شرح عقائد جلالی" میں فرماتے ہیں:

"لا نزاع بين الشيخ (الاشعری) والمعتزلة في حدوث الكلام اللفظي انما نزاعهم في اثبات الكلام النفسي وعدمه"

اور شیخ شہاب خفاجی "حاشیہ بیضاوی" میں فرماتے ہیں:

"والاشاعرة قالوا كلامه قديم نفسي قائم بذاته لا باصوات وحروف ولا نزاع بينهم وبين المعتزلة في حدوث كلامه اللفظي انما النزاع في اثبات النفسي"

ان تمام عبارات کا حاصل یہی ہے کہ اہل سنت اور معتزلہ میں اصل اختلاف "کلام نفسی" کی نفی واثبات کا ہے، ورنہ کلام لفظی کا حادث ومخلوق ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے۔

اس تمہیدی گذارش کے بعد نیاز صاحب کے شبہات یا مغالطات کا نمبروار جواب ملاحظہ ہو! پہلے ہم "نگار" کا شبہ خود اسی کے الفاظ میں نقل کریں گے، اس کے بعد اپنا جواب عرض کریں گے۔ واللہ الموفق۔

نگار (۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ از خود وہ بھی وجود میں آیا ہے۔ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس طرح

قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا، حالانکہ قدیم صرف ذاتِ خدا کی ہے اور اگر اوّل صورت مانی جائے، تو قرآن کو "شے مخلوق" ماننا پڑے گا، لیکن "شے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شیٔ ھالک الا وجھہ" اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے، اس لیے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔"

الفرقان جواب عرض کرنے سے پہلے یہ تنقیح ضروری ہے کہ نیاز صاحب کی مراد قرآن مجید سے کیا ہے؟ اگر وہ "کلامِ لفظی" مراد ہے، جس کا وجود الفاظ و اصوات یا نقوش سے وابستہ ہے اور جس کا قیام عموماً مخلوقہ ہی کے ساتھ ہوتا ہے، تو جواب یہ ہے کہ یہ خدا کا مخلوق ہے اور دوسری "اشیاء مخلوقہ" کی طرح بے شک اس کے لیے بھی "بقاء دائم" نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود وہ "خدا کا کلام" ہے، بایں معنی کہ اس کی تالیف اسی کی طرف سے ہے اور "لوحِ محفوظ" یا "لسانِ ملک" پر اس کی خلق و ایجاد، یا قلبِ رسول میں اس کی القاء بلا توسط کسی کے براہِ راست اُسی کی جانب سے ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کو کلامِ خدا کہا جاتا ہے اور ہم جو مختلف اوقات میں اپنے قصد و ارادہ سے اس کی تلاوت کرتے ہیں یا کاغذ پر اس کو لکھتے ہیں، تو یہ اسی کی حکایت ہوتی ہے جس طرح کہ ہم جب غالب کا کوئی شعر اپنی زبان سے پڑھتے یا اپنے قلم سے لکھتے ہیں تو وہ شعر ہمارا نہیں ہو جاتا، بلکہ غالب ہی کا کہلاتا ہے، کیوں کہ اس کو ہمارا پڑھنا یا لکھنا اسی کی نقل و حکایت ہوتی ہے ——— بہر حال اگر سوال میں قرآن مجید سے مراد مذکورہ بالا "کلامِ لفظی" ہے، تو بے شک وہ خدا کے خلق و ایجاد ہی کا نتیجہ ہے اور ہم عرض کر چکے کہ دوسری تمام "اشیاء مخلوقہ" کی طرح اس کے لیے بھی "بقاء دائم" نہیں ہے ———

لیکن اس کی وجہ سے اس کے "کلام خدا" (بالمعنی المذکور) ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نہ نیاز صاحب نے اس کی کوئی دلیل پیش کی ہے اور نہ وہ کرسکتے ہیں۔ اور اگر قرآن مجید سے اُن کی مراد اس کے مطالب و مضامین ہیں، یعنی "کلام نفسی" اور یہ اگرچہ عرفِ عام کے خلاف ہے، لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کی مراد یہی ہوگا، کیوں کہ وہ "مطالبِ قرآن" کے بھی من جانب اللہ ہونے کے منکر ہیں اور اس کے مضامین کو بھی معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "فہم و فراست" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر اس کے قصص کو غلط اور غیر تاریخی بتلاتے ہیں ——— اور ان کا یہ مدعا عجب ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ مضامین قرآن کے بھی وہ من اللہ ہونے کی نفی کریں، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس سوال میں قرآن مجید سے ان کی مراد "کلامِ نفسی" ہوگا ——— تو اس صورت میں ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ حادث و مخلوق نہیں ہے، بلکہ قدیم ہے۔ رہا اس پر نیاز صاحب کا یہ شبہ کہ قدیم صرف ذاتِ خدا ہے، تو یہ محض مغالطہ ہے، اُس کی ذات مقدسہ کی طرح اُس کی صفات بھی قدیم ہیں، یعنی جس طرح حق تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، اسی طرح اس کا علم اور اس کی قدرت وغیرہ صفات بھی ہمیشہ سے ہیں اور "کلام نفسی" بھی اس کی صفت ہے، جو قدیم ہے۔[1]

چوں کہ ہمارے اس جواب کی بنیاد "کلام نفسی" کے قدیم اور "کلام لفظی" کے حادث و مخلوق ہونے پر ہے اور آئندہ نمبروں میں بھی ہم کو اس اصول سے

---

[1] ناظرین کرام کو نیاز صاحب کا تیسرا شبہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ "صفاتِ ربانیہ" کی قدامت اُن کو بھی مسلم ہے، لیکن یہاں انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ صرف ذاتِ خداوندی کو قدیم کہا ہے۔ سچ ہے: دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔

کام لینا ہے، اس لیے ہم یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ ہمارا اپنا اختراع نہیں ہے، بلکہ اہل سنّت کے مشہور مسلمات میں سے ہے۔ کتب کلام کی صدہا تصریحات میں سے چند ملاحظہ ہوں:

شرح "عقائد نسفی" میں ہے:

"التحقیق ان کلام اللّٰہ تعالٰی اسمٌ مشترکٌ بین الکلام النفسی القدیم ومعنی الاضافۃ کونہ صفۃً لہ تعالٰی وبین اللفظی الحادث المؤلف من السور والاٰیات ومعنی الاضافۃ انہ مخلوق اللّٰہ تعالٰی۔"

اور "مسامرہ" "شرح مسائرہ" میں اسی مسئلہ "کلام" کے بارہ میں اہل سنّت کے مخالف فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومنھم المعتزلۃ قالوا کلامہ تعالٰی اصوات وحروف یخلقھا فی غیرہ کاللوح المحفوظ وجبریل والرسول وھو حادث عندھم ۔ ۔ ۔ وھٰذا الذی قالتہ المعتزلۃ لاننکرہ نحن بل نقول بہ ونسمیہ کلامًا لفظیًا ولکنّا نثبت امرًا وراء ذٰلک وھو المعنی القائم بالنفس۔"

اور عارف جامی نے "کلام نفسی" کی قدامت اور "کلام لفظی" کے حدوث کے اس مسئلہ کو لباس اور صاحب لباس کی تمثیل سے حل کیا ہے ـــــــ مثنوی "سلسلۃ الذہب" میں اسی مسئلہ کلام باری کے متعلق مسلک اہل سنّت کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مکن از حق کراں چوں معتزلی　　　لایزالیش داں ولم یزلی

حرف وصوتے کہ نو بہ نو حادث | می شود نیست چوں دوال لابث
باشد آں پیشِ عقل خوردہ شناس | مر کلام قدیم را چو لباس
دم بہ دم چوں شود لباس بدل | شخصِ صاحب لباس را چہ خلل

اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات میں ایک جگہ یہی لباس کی مثال دے کر مسئلہ کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

"قرآن کلام خدا است جل سلطانہ کہ بہ لباس حرف وصوت درآوردہ بر پیغمبر ما علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ است وعباد را بہ آں امر و نہی فرمودہ۔ چنانچہ ما کلام نفسی خود را بہ توسط کام و زبان در لباس حرف وصوت درآوردہ ظاہر مے سازیم و مقاصد خفیہ خود را در عرصہ ظہور مے آریم ہم چنیں حضرت حق سبحانہ کلام نفسی خود را بے توسط کام و زبان بہ قدرت کاملہ خود لباس حرف وصوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و اوامر و نواہی خفیہ خود را در ضمن حرف وصوت آوردہ بر منصہ جلوہ دادہ است۔"

دوسری جگہ ایک اور مکتوب میں "کلام نفسی" کی قدامت اور کلام لفظی" کے حدوث کے اسی مسئلہ کو اس طرح صاف فرماتے ہیں:

"والحال کہ بہ تلاحق افکار منقح شدہ است گوئیم کہ محلِ نزاع اگر حروف و کلمات اند کہ دوال اند بر کلام نفسی شک نیست کہ حادث اند و مخلوق و اگر مدلولات مراد باشند قدیم و غیر مخلوق است۔"

ایک اور مکتوب میں اس سے زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ فرماتے ہیں:

"حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کہ از شجرہ مبارکہ کلام حق

شنید جل سلطانہ نسبت آں کلام بہ حق جل سلطانہ ہم چو نسبت مخلوق بود بہ خالق و ہم چو نسبت کلام بہ متکلّم و ہم چنیں کلامے کہ از حضرت جبریل علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام شنید نسبت آں کلام بہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ ہم چو نسبت مخلوق بود بہ خالق غایت مافی الباب آں کلام نیز کلام حق است جل سلطانہ و منکر آں کافر و زندیق گویا کلام حق مشترک است درمیان کلام نفسی و کلام لفظی کہ بے توسط امرے حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ ایجاد آں فرماید و ایں کلام لفظی نیز بہ حقیقت کلام حق باشد جلّ و علا پس ناچار منکرِ آں کافر بود۔"

ان عبارات سے مندرجہ ذیل امور بہ صراحت ثابت ہوئے:

۱۔ "کلام الٰہی" کا اطلاق "کلام نفسی" پر بھی ہوتا ہے اور "کلام لفظی" پر بھی۔

۲۔ "کلام نفسی" قدیم اور ذاتِ حق کے ساتھ قائم ہے اور "کلام لفظی" حادث و مخلوق ہے۔

۳۔ "کلام لفظی" حادث و مخلوق ہونے کے باوجود اس معنی سے "کلام الٰہی" ہے کہ حق تعالیٰ ہی بلاواسطہ اُس کا موجد ہے اور اس کی تالیف و تنزیل اُسی کی طرف سے ہے اور جو کوئی "کلام لفظی" کے بہ ایں معنی کلام الٰہی ہونے کا انکار کرے، وہ کافر و زندیق ہے۔

بلکہ عرف عام اور علیٰ ہذا عام دینی محاورات میں تو "قرآن" اور "کلام الٰہی" سے عموماً یہی "کلام لفظی" مراد ہوتا ہے، کیوں کہ "احکامِ تکلیفیہ" کا تعلق اسی سے ہے اور اسی کا "کلام الٰہی" ہونا اُمّت کا اجماعی عقیدہ ہے اور اس کے "کلام الٰہی" ہونے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ حق تعالیٰ کا مخلوق ہے یا اُس کی مرضی

ومنشاء اور اوامر ونواہی پر اس کی دلالت ہے، بلکہ اس کو "کلام الٰہی" اسی خصوصیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی نظم وعبارت کی تالیف و ایجاد بھی بلا واسطہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور اسی واسطے قرآن پاک کے تراجم کو "کلام اللہ" نہیں کہہ سکتے۔

علامہ قوشجی "شرح تجرید" میں فرماتے ہیں:

"لا نزاع فی اطلاق اسم القرآن وکلام اللہ تعالیٰ بطریق الاشتراک علیٰ ھٰذا المؤلف الحادث وھو المتعارف عند العامہ والقراء والاصولیین والفقہاء ۔ ۔ ۔ واطلاق ھذین اللفظین علیہ لیس بمجرد انہ دال علیٰ کلامہ القدیم حتیٰ لوکان مخترع ھٰذہ الالفاظ غیر اللہ تعالیٰ لکان ھذا الاطلاق بحالہ بل لان لہ اختصاصاً اٰخر بہ تعالیٰ وھو انہ اخترعہ"

پھر یہی علامہ قوشجی یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ جو شخص اس قرآن پاک کے جو مخصوص الفاظ وعبارات ہیں مصاحف میں لکھا جاتا ہے "کلام الٰہی" ہونے سے انکار کرے اور اس کو کسی انسان کی تالیف قرار دے، وہ مسلّم طور پر کافر اور خارج از اسلام ہے ـــــ فرماتے ہیں:

"ومن انکر کلامیۃ ما بین دفتی المصحف انما یکفر لو اعتقد انہ لیس کلام اللہ تعالیٰ بمعنیٰ انہ من مخترعات البشر"

بہرحال نیاز صاحب کے اس مغالطہ کے جواب میں ہم نے جو کچھ کہا ہے، وہ متکلمین کی تصریحات اور اہلِ سُنّت کے مسلّمات ہی کی بنا پر کہا ہے اور کتبِ کلام کی جو عبارات ہم نے یہاں نقل کی ہیں، وہ صرف یہی ظاہر کرنے

کے لیئے پیش کی ہیں، ورنہ ہم جانتے ہیں کہ ان عبارات سے جناب نیاز پر حجت نہیں قائم کی جاسکتی جس بے راہ کے نزدیک قرآن بھی "اساطیر الاولین" ہو اس کے سامنے اقوالِ سلف کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے؟

نگار (۲) "اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا، جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں، جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلامِ مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہوجائے، اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہوگیا"

الفرقان اوپر کے جواب میں بتلایا جاچکا ہے کہ جو قرآن شریف کاغذ پر لکھا جاتا ہے یا پریس میں چھاپا جاتا ہے اور جو تلاوت کے وقت ہماری زبانوں سے ادا ہوتا ہے، وہ درحقیقت نقل وحکایت ہے اُس "کلام الٰہی لفظی" کی جس کی حقیقت اوپر واضح کی جاچکی ہے اور قرآن پاک کے ان مکتوبہ یا مطبوعہ نسخوں کو اور علیٰ ہذا ہماری تلاوت کو جو قرآن مجید کہا جاتا ہے، تو وہ اسی حیثیت سے اور یہ بلاتشبیہ ایسا ہی ہے، جس طرح کہ ہم دیوان غالب کے ہر نسخے کو خواہ وہ کسی شخص کے قلم کا لکھا ہوا یا کسی پریس کا چھپا ہوا ہو، دیوانِ غالب ہی کہتے ہیں ـــــ اب اگر دیوانِ غالب کا کوئی نسخہ ضائع ہوجاتا ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غالب کا کلام ہی ضائع ہوگیا، اسی طرح قرآن پاک کے نسخہ کے تلف ہوجانے سے کلامِ الٰہی کے ضائع ہوجانے کا نتیجہ نکالنا نیاز ہی جیسے "اربابِ علم ودانش" کا کام ہوسکتا ہے۔

نگار (۳) "اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے، تو اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں،

یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصوّر کیا جائے یا صفاتِ خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے، اس لیے لامحالہ اسے "صفتِ ربّانی" ماننا پڑے گا، لیکن چوں کہ خدا کی ہر صفت اُس کی ذات سے جدا نہیں ہے، اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ، یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے"

الفرقان | نیاز صاحب کے آخری خط کشیدہ فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہاں قرآن پاک سے ان کی مراد "کلامِ لفظی" ہی ہے، جو عربی زبان میں دوسرے درجہ کے "کلام نفسی" کی تعبیر ہے اور عرفِ عام میں اسی کو قرآن پاک کہا بھی جاتا ہے ــــ اور ہم بتلا چکے ہیں کہ وہ حادث و مخلوق ہے اور کلام نفسی جو قدیم اور قائم بذاتہ تعالیٰ ہے، وہ از قبیلہ الفاظ ہی نہیں، چہ جائیکہ اس کو عربی یا عجمی کہا جا سکے، لہٰذا عربی زبان کا قدیم ہونا کسی طرح بھی لازم نہیں آسکتا۔

عقائد کی مشہور کتاب "مسامرہ شرح مسائرہ" میں صراحۃً مرقوم ہے:

"ان کلامہ النفسی ۔ ۔ ۔ لا یوصف بانہ عبریٌ ولا سودی ولا عربی انما العبری والسودی والعربی ھو اللفظ الدال علیہ[1]"

نگار | (۴) "اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے، جو جبریل کے ذریعہ سے آں حضرت تک پہنچایا گیا تھا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اس کو اسی طرح نطق کیا تھا، جس طرح خدا نے کیا تھا"

---

[1] اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ عربیت یا عجمیت "کلام نفسی" کی صفت نہیں، بلکہ یہ اس "کلام لفظی" کے اوصاف ہیں، جو اس پر دلالت کرتا ہے۔

بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں، جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے، جو بالکل محال ہے۔"

الفرقان | اجی! کس نے آپ سے یہ تسلیم کرنے کو کہا کہ "قرآن کا ہر ہر لفظ نطقِ خداوندی" ہے۔ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ الفاظ قرآن یا بالفاظ دیگر "کلام لفظی" کو کلامِ الٰہی" اس حیثیت سے کہا جاتا ہے کہ اُس کی تالیف وتنزیل بلاواسطہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی بلا توسط کسی شے آخر کے اُن کا خالق و موجد ہے اور حق تعالیٰ کے لیے جو "صفت کلام" ثابت کی جاتی ہے اور اس کو جو "متکلم" مانا جاتا ہے، تو اس کا یہ مطلب تو کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے کہ وہ ہماری طرح کام ودہن سے بولتا ہے اور آلاتِ نطق سے تلفظ کرتا ہے، بلکہ جس طرح اس کی دوسری صفات مثلاً علم اور سمع اور بصر وغیرہ کا حال ہے کہ وہ بلا کانوں کے سُنتا اور بلا آنکھوں کے دیکھتا اور بلا دل ودماغ کے علم محیط رکھتا ہے، اسی طرح اس کی "صفت کلام" بھی کام ودہن سے بے نیاز ہے۔ سیدنا حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "فقہ اکبر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"وصفاته كلها بخلاف صفات المخلوقين يعلم لا كعلمنا ويقدر لا كقدرتنا ويرى لا كرويتنا ويتكلم لا ككلامنا ويسمع لا كسمعنا نحن نتكلم بالآلات والحروف والله سبحانه يتكلم بلا آلة وحروف"

یعنی حق تعالیٰ کی تمام صفات حقیقت کے لحاظ سے ہماری صفات سے

بالکل مختلف ہیں۔ اس کا علم، اس کی قدرت، اس کا دیکھنا اور سننا ہمارے علم، ہماری طاقت اور ہمارے دیکھنے سننے سے بالکل مختلف الحقیقت ہے، گویا کہ اشتراک اسمی کے سوا دونوں میں کوئی مشابہت اور مماثلت نہیں اور یہی حال "صفت کلام" کا ہے کہ ہم آلات اور حروف کے ساتھ تکلم کرتے ہیں اور خدا کا "تکلم" بلا آلات اور بغیر حروف کے ہے۔

بہرحال قرآن پاک کو "کلام خدا" ماننے کی وجہ سے جیسا کہ اسلامی عقیدہ ہے کسی طرح بھی خدا اور بندوں میں مماثلت و مشابہت لازم نہیں آتی۔

نگار (۵) "قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا" وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے، اس لیے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بلحاظ ترتیب مختلف ہے، جو لوح محفوظ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے، حالاں کہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیے۔

الفرقان ہم بتلا چکے ہیں کہ قرآن شریف جو مخصوص عربی عبارت میں ہمارے سامنے موجود ہے، وہ حادث ہی ہے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس حادث ہونے کے باوجود وہ کلام خدا ہے ——— اس لیے نیاز صاحب کے اس استدلال کی ساری عمارت ہی غلط ہے۔ لیکن جس عجیب و غریب منطق کے ذریعہ آنجناب نے قرآن شریف کا حدوث یہاں ثابت کیا ہے، اس سے ان کے علم و فہم اور اسلامی معلومات کی وسعت کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ جواب طویل ہو جاتا ہے، تاہم ایک ہلکی سی نظر اس پر بھی ڈال لیجیے!

نیاز صاحب نے اس نمبر میں قرآن کو حادث ثابت کرنے کے لیے جن مقدمات سے

کام لیا ہے، اُن میں ایک مقدمہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی جو ترتیب ہے، وہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے اور اس کو انھوں نے بہ طور ایک مسلّمہ امر کے پیش کیا ہے، حالاں کہ نہ یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور نہ اس پر نیاز صاحب کوئی دلیل ہی پیش کر سکتے ہیں۔ جمہور اہلِ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کی موجودہ ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق ہے اور یہی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

نیاز صاحب نے بالکل غلط طور پر یہ فرض کرنے کے بعد کہ موجودہ قرآن کی ترتیب لوحِ محفوظ کی ترتیب سے مختلف ہے، غالباً اپنی "منطق دانی" اور "معقولیت" کا ثبوت دینے کے لیے اس مشہور منطقی قضیہ کلیہ سے بھی کام لیا ہے کہ "ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے" اور اسی سے پھر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "قرآن پاک حادث ہے" حالاں کہ یہاں یہ کلیہ چسپاں ہی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جو کلام "لوحِ محفوظ" میں مندرج ہے، خود اس میں تو اس تقدیر پر بھی کوئی تغیر نہیں ہوا۔

بہ ہر حال اگرچہ یہ صحیح ہے کہ موجودہ قرآن جو بہ زبان عربی ہے، وہ حادث ہے لیکن اس حدوث کے اثبات کے لیے جو دلیل نیاز صاحب نے پیش کی ہے، وہ ان کی علمی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے اچھی چیز ہے۔ علیٰ ہذا اس حدوث کی بنیاد پر انھوں نے قرآن پاک کے کلامِ خدا ہونے سے جو انکار کیا ہے، وہ بھی محض بے دلیل ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مسلمان اس "قرآن عربی مبین" کو کس معنے سے "کلامِ خدا" مانتے ہیں یا وہ اپنے جرم کو ہلکا ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں۔

نگار (۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف بجا بجا نازل ہوا ہے، یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے

جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی، اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں، گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔"

الفرقان جی ہاں! قرآن پاک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف اوقات میں بتدریج نازل ہوا ہے، لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ اس نزول سے پہلے وہ "لوحِ محفوظ" میں بھی موجود نہ تھا۔ کیا ان دونوں باتوں میں کوئی عقلی لزوم ہے یا اس طرح بے دلیل باتیں کرنا بھی آج کل کی "عقلیت" کا کوئی شعبہ ہے؟

رہا آپ کا یہ سوال کہ "پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں، گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں"—— تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اُس "دانائے کُل" کا کلام ہے، جس کے لیے ماضی و حال اور مستقبل بالکل یکساں ہیں، تو اگرچہ "اُن واقعات" کے وجود خارجی سے بہت پہلے لوحِ محفوظ میں یہ کلام پاک "ثبت ہو چکا تھا، مگر اُس وقت بھی اس کا تعلق عہدِ نبوی ہی سے تھا، گویا "لوحِ محفوظ" میں جو رقم تھا، وہ ایک پیشینی نقل تھی اُس قرآن مجید کی، جو چھٹی صدی عیسوی میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج نازل ہو کر ایک مرتب مجموعہ بننے والا

تھا ـــــ اب جو شخص حق تعالیٰ کے علم اور اُس کی قدرت کو اپنے علم و قدرت کے برابر یا لگ بھگ سمجھے، تو اس کو اس میں استبعاد ہو سکتا ہے، لیکن جن کے دل کی آنکھیں اندھی نہیں ہوئی ہیں اور جو خدا کے علم و قدرت کی بے پایاں وسعت کا یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے اُس کے سمجھنے اور اس پر ایمان لانے میں کوئی بھی اشکال و استبعاد نہیں ہو سکتا۔ واللہ یھدی من یّشاء الیٰ صراط مستقیم۔

نگار (۷) "اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا، تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظِ قُل سے شروع ہوتی ہیں، یعنی، جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" دراں حالے کہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے؟ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتّب کر لی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟"

الفرقان اس کا جواب وہی ہے، جو اوپر عرض کیا جا چکا۔ اعادہ کی حاجت نہیں۔

نگار (۸) "اگر کلام مجید خدا کا کلام ہے، تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے[1] (؟) جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر مالکِ یوم الدّین تک دعا کا انداز ایسا ہے، گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتہً "ایاک نعبد" سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب

---

[1] "نگار" کا یہ خط کشیدہ فقرہ نیاز صاحب کی علمی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے

کیا جارہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے؟ اگر سورہ فاتحہ پہلے سے "لوحِ محفوظ" میں منقوش ہوتی، تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا"۔

الفرقان | نیاز صاحب نے اس نمبر میں قرآن مجید کے کلام خدا نہ ہونے پر جو دو دلیلیں پیش کی ہیں، اگر وہ اپنی "معصومیت" اور بھولا پن ثابت کرنے کے لیے "تجاہلِ عارفانہ" نہیں ہے، تو یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ "اسلامیات" پر انھوں نے جو بھی صحیح یا غلط علمی قسم کے مضمون کبھی لکھے ہیں، وہ سب کہیں سے مسروقہ ہیں اور خود اُن کو اسلامی علوم سے مَس بھی نہیں ہے —— ورنہ یہ دونوں مغالطے ایسے ہیں کہ ان کا جواب قرآن پاک سے متعلق عام اور معمولی کتابوں بلکہ قرآن کے مختصر مختصر حاشیوں تک میں مذکور ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے متعلق تو اتنا سمجھنا کافی ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اس کے ساتھ تلفظ نہیں فرمایا ہے، بلکہ ہماری تلاوت کے لیے اس کی تالیف و تنزیل فرمائی ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ان بابرکت کلمات سے ہم قرآن پاک اور دوسرے اچھے کام شروع کیا کریں اور یہ اس کا ہم پر انتہائی رحم ہے کہ اس نے ہماری عقلوں کے قصور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہماری یہ راہ نمائی فرمائی، ورنہ ایسا جامع اور پُر معنی اور پھر اتنا مختصر اور سُبک جُملہ تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی —— اس متبرک جُملہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی معجزانہ جامعیت اور معنوی وسعت معلوم کرنے کے لیے نیاز صاحب متداول تفاسیر میں صرف "تفسیر کبیر" ہی ملاحظہ فرمالیں —— اور یہی حیثیت الحمد شریف کی ہے۔ اس میں بھی حق تعالیٰ نے ہم کو اپنی حمد و ثنا اور اُس بہترین طریقۂ دعا کی تلقین کی ہے، جس کا ہم خود

ادراک نہیں کر سکتے تھے: "اللّٰھم لا نحصی ثناءً علیك انت کما اثنیت علیٰ نفسك"

نیاز صاحب نے سورۂ فاتحہ میں طریقۂ خطاب کی تبدیلی سے قرآنِ پاک کے کلامِ الٰہی نہ ہونے پر جو "استدلال" کیا ہے، وہ تو اس قدر جاہلانہ اور بوگس ہے کہ کسی نیاز جیسے شخص سے اس کی توقع اُن لوگوں کو بھی نہ ہو سکتی تھی، جو ان کی "علمی حیثیت" کے بھی قائل نہیں ہیں — آخر وہ ایک اچھے ادیب تو ہیں ہی، "صنعت التفات" جیسی عام "صنعت" سے اُن کی ناواقفی و بے بہرگی کیا معنی؟

"صنعتِ التفات" (یعنی کسی خاص مقصد اور جذبہ کے ماتحت کلام میں غیبت سے مثلاً خطاب کی طرف یا خطاب سے غیبت کی طرف متکلم کا انتقال) عربی کے علاوہ اُردو اور فارسی ادب میں بھی پایا جاتا ہے اور خاص کر عربی میں تو بکثرت مستعمل ہے۔ چند نظیریں ملاحظہ ہوں۔

زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر مسافع بن حذیفہ، بنی عمرو کے مرثیہ میں کہتا ہے:

ابعد بنی عمرو اسرّ بمقبل

من العیش او آسیٰ علی اثر مدبر

(ترجمہ) کیا بنو عمرو کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عیش و راحت کی آنے والی گھڑیوں کی کوئی مسرّت یا گذر جانے والے لمحات پر کوئی رنج مجھے ہو سکتا ہے، یعنی اب نہ مجھے عیش و راحت ملنے کی کوئی خوشی ہوگی اور نہ اُس کے جانے کا غم۔

دیکھیے! اس پہلے شعر میں بنی عمرو کا ذکر شاعر نے غائبانہ کیا ہے۔ اس کے بعد وہ بنی عمرو کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

سلام بنی عمرو! علی حیث ھامکم جمال الندی والقنا والسنوّر

(ترجمہ) اے بنی عمرو! جن سے مجلس کی زینت تھی اور نیزے اور ہتھیار جن پر سجتے تھے، تم پر اور اُس سرزمین پر جہاں تمھارے سر دفن ہیں، میرا سلام ہو۔

سخن شناس سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے شعر میں طریقہ خطاب کی اس تبدیلی نے کس قدر جان ڈال دی ہے۔

عرب کا ایک اور مشہور شاعر ابن الطثریہ کہتا ہے:

عقیلیۃٌ اما ملاث ازارھا

فدعص واما خصرھا فبتیل

یعنی، میری محبوبہ قبیلہ بنی عقیل میں سے ہے، اُس کی سُرینیں بڑی، پُرگوشت ہیں اور کمر ایسی پتلی ہے کہ گویا ٹوٹی ہوئی ہے۔

دیکھیے! اس شعر میں شاعر نے اپنی محبوبہ عقیلیہ کا ذکر غائبانہ طور پر کیا ہے، لیکن اس کے بعد وہ التفات کر کے کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے:

الیس قلیلاً نظرۃٌ ان نظرتہا

الیک وکلّا لیس منک قلیل

یعنی، تیرا وہ تھوڑا سا دیدار جو مجھے نصیب ہوتا ہے، کیا تھوڑا نہیں ہے؟ (پھر خود ہی اس خیال سے توبہ کرتے ہوئے کہتا ہے:) نہیں ہرگز نہیں، تیری طرف سے جو بھی ہے، وہ تھوڑا نہیں ہے،

یہ صرف دو مثالیں ہیں، ورنہ عربی لٹریچر سے اس قسم کی صدہا بلکہ ہزارہا نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں اور عربی ادب سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ "صنعتِ التفات" اگر برمحل ہو، تو وہ کلام کے اعلیٰ محاسن اور لطائف میں سے ہے ـــــ اور سورۂ فاتحہ میں جس طرح اُس کا استعمال ہوا ہے

تحقیقت ایک صاحبِ ذوقِ سلیم کے لیے اس میں نہ صرف اعلیٰ درجہ کا حسن
عت ہی ہے، بلکہ وجد و سرمستی کا بھی پورا سامان ہے۔ ـــــ لیکن:

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے؟

ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نورہ۔

اگر جناب نیاز یا اور کوئی صاحب اس "التفات" کے لطائف و محاسن معلوم
نا چاہیں، تو تفسیر کبیر یا تفسیر فتح العزیز ہی ملاحظہ فرمالیں۔ مؤخرالذکر کا تو
و ترجمہ بھی عام طور سے ملتا ہے۔

نگار (۹) "قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر
پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفارِ مکہ
اور ان کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت
لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ
ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہوچکا تھا اور قرآن مجید کی
حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہوجاتی ہے جس میں واقعات کے
ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے ورانحالیکہ
کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔"

فرقان اس کا جواب بھی وہی ہے جو ہم نمبر ۶ کے ضمن میں عرض کرچکے ہیں،
ن کا حاصل یہ ہے کہ "نزولِ قرآن" سے پہلے "لوحِ محفوظ" میں جو بھی قرآن درج
ا، تو اس کا بھی خلق و انشا بعد میں آنے والے اُس وقت اور اُس ماحول ہی کے
ظ سے ہوا تھا جس وقت اور جس ماحول میں وہ بعد میں نازل ہوا اور جیسا کہ ہم نے
ن کیا وہ بس ایک پیشینی نقل تھی اُس قرآن پاک کی جو چھٹی صدی مسیحی میں

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنے علم محیط اور اپنی قدرتِ کاملہ سے وقتِ نزول سے ہزار ہا برس پہلے "لوحِ محفوظ" میں ثبت فرما دیا تھا ـــــ ہماری عرض کی ہوئی اس حیثیت اور "پیشین گوئیوں والی تاریخی کتاب" کی حیثیت میں جو فرق ہے، امید ہے کہ جناب نیاز اور اُن کے مقلدین اگر غور کریں گے، تو اس کے سمجھنے سے محروم نہ رہیں گے۔

نگار | (۱۰) "خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفت "نطق" کا ذکر کیا جائے، تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو، جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اس کو سُننے اور دیکھنے کے لیے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لیے زبان یا الفاظ سے اُسے بے نیاز ہونا چاہیے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے"

الفرقان | نیاز صاحب نے اس نمبر میں نہ صرف یہ کہ خود ہی فرض کر لیا ہے، بلکہ اپنے ناظرین کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان جو قرآن پاک کو "خدا کا کلام" کہتے ہیں، تو وہ اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ جس طرح ہم الفاظ قرآن کو اپنے کام و دہن سے ادا کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک معاذ اللہ خدا نے بھی اپنی "زبان" اپنے تالو، اپنے حلق اور اپنے ہونٹوں سے اس قرآن کو ادا فرمایا ہے، حالاں کہ جو غیر مسلم بھی مسلمانوں کے عقائد سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، وہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ یہ نیاز صاحب کا محض افترا ہے، جس کو کسی طرح ان کی ناواقفی یا سادہ لوحی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ـــــ ہم بتلا چکے ہیں کہ قرآن

"عربی مبین" کو مسلمان بس اس حیثیت سے "کلامِ الٰہی" مانتے ہیں کہ اس کی تالیف وتنزیل اور محالِ معلومہ میں اس کی ایجاد وتخلیق بلا واسطہ کسی شے آخر کے حق تعالیٰ کی طرف سے ہوئی ہے۔ فرمائیے کہ اس کے لیے کام ودہاں اور حلق وزبان کی کیا ضرورت ہے؟

دراصل جو حضرات نیاز صاحب اور ان کی گمراہیوں سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ نیاز خود بھی اتنے جاہل اور مسلمانوں کے ایسے مشہور عام عقیدے سے ناواقف نہیں ہیں، بلکہ وہ صرف اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے اس "تجاہل" کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ "قرآن پاک" کے کلام خدا ہونے سے اُن کا انکار تنزیہ خداوندی کے نیک جذبہ کے ماتحت ہے، حالاں کہ ان کو خدا کے ساتھ جتنی "ہمدردی" ہو سکتی ہے وہ معلوم ہے۔

علاوہ ازیں اگر واقعی ان کے انکار کی بنیاد اسی تنزیہ پر ہوتی، تو وہ صرف خدا کے تکلم بہ معنی تلفظ و "نطق" کا انکار کرتے، حالانکہ انھوں نے نہایت صفائی اور ڈھٹائی کے ساتھ قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے سے بھی انکار کیا اور اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم وفراست کا نتیجہ قرار دیا، پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اس کے بیان کردہ قصص وواقعات کو غیر تاریخی غیر محقق اور یہود ونصاریٰ کے بیانات سے ماخوذ بتلایا اور اسی بنا پر ہم نے اُن کو "مرتد" یا "منافق" لکھا ہے۔

"وسیع المشربی" کے مدعی نیاز صاحب کے ایک حمائتی نے شکوہ کیا ہے کہ جب نیاز صاحب رسول اللہ کی صداقت اور بلند اخلاقی کو تسلیم کرتے

ہیں اور جون ہی کے پرچہ میں صاف لکھتے ہیں:

"میں رسول اللہ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے" تو اُن کو "مرتد" "منافق" اور "خارج از اسلام" کیوں کہا جاتا ہے؟"

ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ "صداقت" اور "بلند اخلاقی" کا ایسا اقرار ابو جہل بھی کرتا تھا۔ حدیث کی مشہور اور مستند کتاب جامع ترمذی میں ہے۔ اُس نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

یا محمد انا لا نکذبك وانما نکذب ما جئتنا به	اے محمدؐ! ہم تم کو جھوٹا نہیں سمجھتے، ہاں جس قرآن کو آپ لائے ہیں ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

تو قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

اَنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝	بے شک یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم "آیاتِ الٰہیہ" کا انکار کرتے ہیں۔

پس نیاز صاحب کا جرم اس اقرار صداقت کے باوجود وہی ہے، جو ابو جہل کا تھا اور اس لیے ہمارے نزدیک ان کا حکم اور ان کا مذہب بھی وہی ہے، جو اُس قدیم دشمنِ ایمان کا تھا۔ ("الفرقان")

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

نیاز فتحپوری کے دس سوالوں کے جوابات

(جناب مولانا سعید احمد صاحب ایم اے "مدیر برہان" دہلی)

۱۔ قرآن مجید (بہ حیثیت کلام خداوندی ہونے کے) خدا کے ساتھ از خود وجود میں آیا ہے۔ نیاز صاحب اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کا خدا کی طرح قدیم ہونا لازم آتا ہے، حالاں کہ قدیم سوائے خدا کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے، لیکن ان کا اعتراض سراسر لغو اور باطل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب فلسفہ کے ابتدائی طالب علم کی طرح یہ بھی نہیں جانتے کہ قدیم اور واجب الوجود میں کیا فرق ہے؟ تمام علماء کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ تعدد و جباء محال ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ واجب الوجود ایک سے زیادہ ہوں، کیوں کہ واجب الوجود کی ماہیت عین وجود ہے، اس لیے یہ کلی ایسی ہے جو منحصر فی فردِ واحد ہے، اس کے لیے تعدّد ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی رہا قدیم تو اس کے لیے کسی کے نزدیک بھی تعدّد محال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اربابِ منطق و فلسفہ عقل اوّل کو ذات واجب الوجود کی طرح قدیم مانتے ہیں اور معلول اوّل ہونے کی وجہ سے واجب الوجود اور عقل اوّل میں صرف تقدّم و تاخّر ذاتی کے قائل ہیں، تقدّم و تاخّر زمانی کے نہیں اور آپ دُور کیوں جاتے ہیں، عالم کو ہی

دیکھ لیجیے، معتزلہ کا ایک بڑا فرقہ اور حکماءِ اسلام میں فارابی، ابنِ سینا اور ابنِ رشد خدا کو واجب الوجود اور قدیم ماننے کے ساتھ ساتھ عالم کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ افسوس ہے نیاز صاحب منطق و فلسفہ کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ ہر ممکن الوجود کے لیے حادث ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ قدیم بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ جی ہاں! قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں، جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اس پر نیاز صاحب کا اعتراض یہ ہے: "تو کلام کا ہر نسخہ کلامِ خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا" سخت افسوس ہے کہ نیاز صاحب نے یہ اعتراض کر کے بھی اپنی انتہائی لاعلمی کا ثبوت دیا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی شے کی صفت عرضی کے عدم سے خود اس شے کی ذات اور ماہیت کا عدم لازم نہیں آتا۔ مثلاً ہنسنا، رونا، کھانا اور پینا، یہ سب انسان کی صفات عرضیہ ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کے معدوم ہو جانے سے موصوف یعنی، انسان کا معدوم ہو جانا لازم نہیں آتا، پس اسی طرح قرآن مجید کے الفاظ و حروف کا پریس سے چھپنا اور انسان کی زبان و حلق سے ادا ہونا یا ان الفاظ کا ایک خاص کمیت و مقدار کے کاغذ پر مرتسم ہونا یہ سب قرآنی الفاظ کی صفاتِ عرضیہ ہیں۔ اس بنا پر اگر قرآن مجید کا ایک نہیں، بلکہ سب نسخے بھی ضائع ہو جائیں، تب بھی اس سے قرآن مجید کا ضائع ہو جانا لازم نہیں آتا۔ وہ اگر کاغذ پر جلوہ نما نہیں ہوگا، تو لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہوگا اور اگر خدانخواستہ کسی سینہ میں

بھی نہ ہوگا، تو عالمِ حقیقت میں ضرور ہوگا۔ موجودہ دورِ ترقی میں جب کہ سائنس دان زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے متعلق یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ الفاظ زبان سے نکلنے کے بعد فنا نہیں ہوتے، بلکہ وہ فضا میں موجود رہتے ہیں، یہ سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے کہ قرآن مجید کے تمام نسخے اگر ضائع بھی ہوجائیں، تب بھی نفسِ قرآن مجید فنا نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ باقی رہے گا۔

۳۔ قرآن پاک خدا کا کلام ہے اور نیاز صاحب نے جو دو صورتیں بتائی ہیں، اُن میں سے وہ ایک صورت کے ساتھ قائم ہے، یعنی، وہ خدا کا عین ذات نہیں، بلکہ صفتِ ربّانی ہے۔ اب نیاز صاحب اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "چوں کہ خدا کی ہر صفت اُس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے"۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نیاز صاحب ازراہِ کرم خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، قدرت، خلق وغیرہ کی نسبت بتائیں کہ وہ انھیں قدیم مانتے ہیں یا نہیں؟ جیسا کہ خود اُن کے بیان سے ثابت ہوتا ہے، وہ یقیناً انھیں قدیم مانتے ہیں، کیوں کہ واجب الوجود محلِ حوادث نہیں ہوسکتا۔ اب نیاز صاحب اس پر غور کریں کہ علم، خلق، قدرت یہ سب صفات قدیم ہیں، مگر ان کا تعلق حوادث کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تعلق بھی خدا ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "خدا نے زید کو پیدا کیا" "خدا نے اپنی قدرت سے مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں فتح دی"۔ اسی طرح جو چیزیں آج کل کی ذہنی و دماغی ترقیات کی پیداوار ہیں، مثلاً ہوائی جہاز، موٹر، ریل، تار برقی، آب دوز کشتیاں وغیرہم ان سب چیزوں کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں خدا کے علم میں ہیں، تو اب بتائیے کہ کیا ان سب چیزوں کے حادث ہونے سے

خدا کی صفت علم، خلق اور قدرت کا حادث ہونا یا خدا کی ان صفات کے قدیم ہونے کے باعث ان تمام حادث چیزوں کا قدیم ہونا لازم آتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یہ تمام "مخلوق" "معلوم" اور "مقدور" چیزیں حادث ہی رہیں گی اور اللہ کی صفت خلق، علم اور قدرت قدیم اور اس کے باوجود ان سب کی نسبت اللہ ہی کی طرف ہوگی، کیوں کہ ان تمام چیزوں کے وجود و حدوث کا سرچشمہ خدا کی یہ صفات ہی ہیں۔ پس اسی پر قرآن مجید کے عربی الفاظ و حروف کو قیاس کر لیجیے۔ کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان قدیم نہیں، حادث ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی الفاظ و حروف کا مبدأ وجود اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا تعلق ہے، اس بنا پر ان الفاظ و حروف کو بھی کلامِ ربانی کہا جائے گا اور اب کلام ربانی کہنے میں نہ عربی زبان کا حدوث مخل ہو سکتا ہے اور نہ ان واقعات حادثہ کا ذکر مانع ہو سکتا ہے، جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ تمثیلاً یہ عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ آپ دیکھتے ہیں، بجلی کا خزانہ (POWER HOUSE) ایک جگہ موجود ہوتا ہے اور جہاں جہاں بجلی کے تار اور قمقمے (BULBS) لگا دیے جاتے ہیں، وہاں بجلی پہنچ جاتی ہے، تو کیا کوئی شخص کسی خاص کمرہ میں ایک مخصوص قمقمہ میں بجلی کی روشنی دیکھ کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کا تعلق بجلی کے خزانہ سے نہیں ہے؟ یا آفتاب کی شعاعیں مختلف مکانوں کے مختلف الاشکال روشن دانوں میں سے چھن چھن کر مکان میں آتی ہیں، تو کیا کوئی عقل مند یہ سمجھتا ہے کہ ان مختلف الشکل شعاعوں کا منبع آفتاب نہیں ہے؟ پس اسی طرح اگر اللہ کی صفتِ کلام کا ظہور عربی کے مخصوص الفاظ و حروف میں ہو رہا ہے، تو کیا محض عربی زبان کے حادث ہونے کی وجہ سے ہم قرآن مجید کے کلامِ خداوندی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں؟ نہیں!

ہرگز نہیں!

۴۔ چوتھے سوال میں نیاز صاحب نے قرآن مجید کو "نطقِ خداوندی" قرار دے کر سخت ترین مغالطہ دینا چاہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کو کلامِ خداوندی تو سب مسلمان مانتے ہیں، لیکن اُسے "نطقِ خداوندی" کوئی بھی نہیں کہتا۔ خود قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ کلام ثابت کی ہے، صفتِ نطق نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اور اللہ نے حضرت موسیٰ سے خوب کلام کیا) اس پر نیاز صاحب اعتراض کرتے ہیں کہ کلام بغیر نطق کے ہو ہی نہیں سکتا، لیکن ہمیں سخت حیرت ہے کہ کس طرح کوئی فہمیدہ انسان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ ایک شاعر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا اور پوری غزل کاغذ پر لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ یہ غزل اُسی شاعر کا کلام ہے یا نہیں؟ کوئی شبہ نہیں کہ کلام ہے، مگر اس کے باوجود نطق بالکل نہیں پایا جا رہا ہے اور اسے تو سب جانتے ہیں کہ بعض اوقات زبانِ حال سے دل کا مطلب ایسے بلیغ پیرایہ میں ادا ہو جاتا ہے کہ زبانِ قال سے بھی ادا نہیں ہوتا اور اسی بنا پر کسی نے سچ کہا ہے: در خموشی معنیست کہ در گفتن نمی آید۔

عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

وللقلب على القلب دليلٌ حين يلقاهُ

وفي الناس من الناس مقاييسٌ واشباهُ

وفي العين غنىً للمرء ان تنطق أفواهُ

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اُس نے زبانِ چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے:

تری عینها عینی فتعرف وجہا و تعرف عینی ما به الوحی یرجع

ایک شاعر آنکھ کے ذریعے کسی ما فی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا "نطق" بتاتا ہے۔ سنیے!

اَلعینُ تُبدِی الذی فی نفسِ صاحبِها من المحبۃ او بغضٍ اذا کانا
والعین تنطق والافواہُ صامِتۃٌ حتّٰی تریٰ من ضمیر القلب تبیانًا

اسی سلسلہ میں ایک اور شعر سن لیجیے، جس میں شاعر کہتا ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ بات بھی آنکھ سے ظاہر کی جا سکتی اور آنکھ سے ہی سمجھی جا سکتی ہے:

وعین الفتی تبدی الذی فی ضمیرہ
و تعرف بالنجوی الحدیث المغمّسا

ممکن ہے، نیاز صاحب اور اُن کے ہم خیال اعتراض کریں کہ ان اشعار سے تو صرف حدیثِ عشق و محبت یا جذبۂ نفرت و عداوت کا آنکھ کے ذریعے ظاہر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پوری گفت و گو بغیر نطق کے کس طرح ہو سکتی ہے؟ تو انھیں سمجھنا چاہیے کہ یہ جو کچھ عرض کیا گیا، محض برائے تمثیل ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دو دل علاقۂ محبت کے باعث پائے گفت گو کو درمیان میں لائے بغیر ایک دوسرے کا مطلب سمجھ سکتے ہیں——— اور یہ ظاہر ہے کہ اُس مطلب کا اظہار ہو گا، تو الفاظ کے ذریعے ہی ہو گا اور ان الفاظ کا انتساب بھی "متکلم" کی طرف ایسا ہی ہو گا، جیسا کہ اُن کے مفہوم و مراد کا——— تو پھر اس میں کون سا عقلی استبعاد ہے کہ ذاتِ احدیت اور حقیقتِ محمدیہ میں قرب قاب قوسین اور اتصال معنوی ہونے کی بنا پر وقتاً فوقتاً مکالمہ ہو اور وہ اہلِ عالم

کے لیے قرآن مجید کی شکل میں ظاہر ہوا۔ خود قرآن مجید نے مکالمۂ الٰہی کی صورت اس طرح بیان کی ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ خدا اُس سے کلام کرے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۗئِ حِجَابٍ	بجز وحی کے ذریعے یا پردے کی آڑ سے۔

جس طرح چشمِ حبیب کی گویائی سے صرف محبت ہی مطلب و مراد سمجھ سکتا ہے، اسی طرح ذاتِ احدیت سے شرفِ ہم کلامی صرف اُن ہی برگزیدہ مقبول کو حاصل ہو سکتا ہے جو منصبِ نبوت و رسالت پر فائز ہونے کی وجہ سے مہبطِ وحی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ارشاد ہے:

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	اُن پیغمبروں میں سے ہی وہ ہیں جن سے خدا نے کلام کیا۔

الغرض کسی کا کلام وہ ہے جس کے ذریعے اُس کے ما فی الضمیر کا اظہار ہو، خواہ عضلات و اعصاب کی راہ سے ہو یا کسی اور طریقے سے[1] اور چوں کہ انبیاء کو غایتِ روحانی لطافت و پاکیزگی کے باعث عالمِ مجردات کے ساتھ بہت کچھ اتصالِ باطنی ہوتا ہے اس لیے وہ صرف عالمِ تجرد کے حقائق کونیہ و واقعاتِ نفس الامریہ ہی کا مشاہدہ نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات حقیقتِ الٰہیہ سے قریب ہو کر ارشاداتِ ربانی کو سُنتے اور اُن سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس افادہ اور استفادہ، تعلیم اور تعلّم اور کلام و خطاب کے لیے نہ عالمِ مادیات کی طرح نطق و گویائی کی ضرورت ہے اور نہ ظاہری گوش و سمع کی، لیکن چوں کہ عالمِ تجرد کی کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں اس وقت تک نہیں آ سکتی، جب تک کہ اس پر عالمِ ناسوت کے لوازم کا خول نہ چڑھا ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہی ارشاداتِ ربانی جن کو خدا نے بیان فرمایا اور پیغمبروں نے سمجھا، ہمارے سامنے آئیں، تو ان ہی

[1] [illegible] ۲۵۵ھ نے اپنی مشہور کتاب "البیان والتبیین" ج ا میں باب البیان کے تحت اس موضوع پر [illegible] مزید تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

الفاظ و کلمات کے جامہ میں آئیں، جنھیں ہم سمجھتے ہیں اور چوں کہ لباس ملبوس کے تابع ہوتا ہے، اس لیے ملبوس کی نسبت جس چیز کی طرف ہوگی، لباس بھی اُسی کی طرف منسوب ہوگا۔ مثلاً ہم کُرتہ پہنتے ہیں، تاکہ ہمارا بدن ڈھکے۔ تو اب دیکھیے، بدن کی نسبت ہماری طرف ہوتی ہے، تو کُرتہ بھی ہماری ہی طرف منسوب ہوتا ہے، یعنی، ہم جس طرح "ہمارا بدن" کہتے ہیں، اسی طرح ہم "ہمارا کُرتہ" بھی کہتے ہیں اور ایسا کہنا بر سبیلِ مجاز یا بطور تشبیہ و استعارہ نہیں، بلکہ بر سبیلِ حقیقت ہوتا ہے اور اگر بالفرض خدا کے لیے نطق مان بھی لیا جائے اور نیاز صاحب کے قول کے مطابق انسان، نبی اور خدا سب کے لیے نطق پایا بھی جائے، تو اس سے خدا کی صفت میں مماثل ہونا کس طرح لازم آتا ہے؟ قرآن مجید میں خدا نے اپنے لیے صفتِ سمع و بصر ثابت نہیں کی؟ تو کیا نعوذ باللہ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سُننے اور دیکھنے والے بندے سُننے اور دیکھنے کی صفت میں خدا کے مماثل ہیں؟ پھر لیس کمثلہٖ شیءٌ کا مطلب کیا ہوگا؟

۵۔ جی ہاں! قرآن مجید جس سلسلہ (غالباً ترتیب) سے نازل ہوا تھا، وہ موجودہ ترتیب سے مختلف ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب کے اعتراض کے بموجب اس سے قرآن مجید کا فنا ہو جانا کس طرح لازم آجاتا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے اعتراض کے لیے جو دلیل قائم کی ہے، اُس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے منطق کی مشہور شکل اوّل، یعنی العالم متغیرٌ و کل متغیر حادث فالعالم حادثٌ پڑھی ہے، لیکن اس کی خبر نہیں کہ قرآن مجید کا ترتیب خاص کے ساتھ آسمان سے نازل ہونا قرآن مجید کی ذاتیات میں داخل نہیں، بلکہ عرضیات میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شے کی عرضیات میں سے کسی عرضی کا تغیر پذیر ہونا

یا فنا ہو جانا خود اُس شے کی ذات کے حدوث و قدامت پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسان کے لیے جب تک جوانِ ناطق ہونا پایا جائے گا، بہر حال وہ انسان رہے گا، خواہ اُس کے اعضاء کی ترتیب یہی رہے یا کچھ اَور ہو جائے۔ ایک تخت کے پایوں کو آپ اول بدل دیجیے۔ اُس کی مقدار جسمانی کو گھٹا کر بڑے سے چھوٹا کر دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پھر بھی تخت ہی رہے گا۔ شیخ سعدیؒ کی گلستاں، بوستاں آج جس ترتیب سے رائج ہیں، اگر اس کو بدل دیا جائے اور باب اوّل کو باب دوم اور باب دوم کو باب اوّل کی جگہ رکھ دیا جائے، تو کیا اس ترتیب کے بدل جانے سے گلستاں اور بوستاں کو "کلامِ سعدیؒ" کہنا نادرست ہوگا؟

۶۔ جی ہاں! قرآن مجید نجماً نجماً نازل ہوا ہے، یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوئی ہے، جس کو اصطلاح میں شانِ نزول کہتے ہیں۔ اب نیاز صاحب اس پر اعتراض یہ کرتے ہیں "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے" سخت حیرت ہے کہ کسی موقع و محل کے مناسب کسی آیت کے نازل ہونے سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ وہ آیت کہیں بھی موجود نہ تھی۔ معلوم نہیں، نیاز صاحب کو اس کی خبر ہے یا نہیں کہ زمانہ کی تعیین محدود جہات کی حرکت سے ہوئی ہے، اس لیے زمان و مکان کی قید اور تفریق صرف اُن چیزوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے، جو ذو جہت ہوں، لیکن اتنا تو وہ بھی مانتے ہوں گے کہ حضرت باریؒ عزّ اسمہٗ قید زمان و مکان سے بلند و بالا ہے۔ اس کے لیے ماضی، حال اور

مستقبل کوئی چیز نہیں۔ مثلاً فرض کیجیے، ایک شخص بہت اونچے کوٹھے پر کھڑا ہے اور اس بام کے نیچے متعدّد کمروں والی ایک عمارت ہے۔ ان کمروں میں سے ہر کمرہ میں ایک ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔ اب اس کے بعد فرض کیجیے کہ مختلف رنگین چیزوں کی ایک مسلسل قطار ہے، جو اس عمارت کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ قطار آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے، تو اس صورت میں دیکھیے، ہر کمرہ والا صرف اُسی چیز کو دیکھتا ہے، جو حرکت کرتی ہوئی اُس کے سامنے سے گذرتی ہے، لیکن اس کے بالمقابل جو شخص اوپر برلبِ بام کھڑا ہوا ہے، وہ بہ یک نظر تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے اور اُن میں سے ہر چیز کی نسبت اُس کے دل میں ایک خیال یا رائے قائم ہے، لیکن وہ سب کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار بہ یک وقت نہیں کرتا، بلکہ کمرہ والوں میں سے جس کے سامنے جو چیز آتی ہے، وہ اس وقت اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کا لوحِ محفوظ میں درج ہونا ایسا ہی ہے، جیسا کوٹھے پر کھڑے ہونے والے شخص کا تمام چیزوں کی نسبت اپنے دل میں ایک یا مختلف خیالات رکھنا اور پھر قرآن مجید کا بتدریج نازل ہونا ایسا ہی ہے، جیسا کہ قطار کی تدریجی حرکت کی صورت میں کسی خاص چیز کی نسبت اپنے خیال کا اُس وقت ظاہر کرنا، جب کہ وہ حرکت کرتے کرتے کسی ایک کمرہ والے شخص کی نظروں کے سامنے آجائے۔ معلوم نہیں، ان دونوں میں کون سا استبعاد عقلی ہے۔

نیاز فتح پوری اسی سوال میں آگے چل کر لکھتے ہیں: "اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے سے ہی تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے

متعلق کیا کہا جائے گا، جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔" اوّل تو یہ سوال ہی بہت ژولیدہ ہے۔ عبارت میں "تو" کہ کر نیاز صاحب نے جملۂ متاخرہ کو جملۂ مقدمہ پر جو متفرع کیا ہے، تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں باہمی ربط کیا ہے، جس کے باعث بعد والا جملہ پہلے جملہ پر متفرع ہو سکے۔ پھر یہ پتہ نہیں چلتا کہ "ان واقعات و حالات" سے معترض کی کیا مراد ہے؟ اگر ان سے مراد واقعاتِ ماضی یا حال ہیں، تو ان کی نسبت ابھی عرض کیا جا چکا ہے اور اگر ان سے مراد وہ واقعات مستقبل ہیں، جن کو قرآن مجید میں بہ صیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً واقعاتِ قیامت، جیسے اذا الشمس کوّرت۔ واذا الجحیم سعرت۔ یا اتی الساعۃ۔ تو ان کی نسبت عرض یہ ہے کہ یہ اگرچہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات ہیں، لیکن چوں کہ اللہ کے علم میں ان کا وقوع یقینی ہے اور اس میں ادنیٰ شائبۂ ریب بھی نہیں، اس لیے ان کو بہ طور جزم و تاکید بہ صیغۂ ماضی بیان کر دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ نیاز صاحب ادیب ہونے کے باوجود زبان و بیان کے ان اسالیبِ بلاغت سے بھی واقف نہیں اور پھر اصل بات وہی ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کا فرق و امتیاز صرف ہم بلاگرفتارانِ مادیت کے لیے ہے، ورنہ حضرت علّام الغیوب کے لیے حضرت آدمؑ کا جنت سے نکلنا، فرعون کا دریائے نیل میں غرق ہونا، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کا فتح یاب ہونا اور قیامت میں چاند اور سورج اور ستاروں کا روئی کے گالوں کی طرح اُڑ جانا، سب برابر ہیں۔

۷۔ نمبر ۷ میں جو سوال کیا گیا ہے، اُس کا جواب بھی نمبر ۶ کے ذیل میں آ چکا ہے، یعنی، اللہ تعالےٰ کے سامنے ازل میں ہی تمام چیزیں موجود تھیں۔ اُن میں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود گرامی بھی تھا اور اس بنا پر قُلْ سے آپ کو جو خطاب کیا گیا ہے، وہ وقتِ نزول آیت کی تشریح ازل میں بھی درست تھا۔

۸۔ اگر کیا؟ واقعی قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ اب رہا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا اعتراض کہ خدا خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے، تو اس کے جواب میں یہ کہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید ہم سب لوگوں کے لیے ایک دستور العمل ہے جس کی روشنی میں ہم عبادات و معاملات انجام دیتے ہیں اور چوں کہ خدا ہمیں تلقین کر رہا ہے اس لیے بندوں کے اسلوب کلام پر ہمیں تلقین کی گئی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے بادشاہ کسی سے کہے کہ "بادشاہِ وقت تم کو ان باتوں کی ہدایت کرتا ہے" تو کیا اس صورت میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کہنے والا بادشاہِ وقت نہیں ہے؟

اِس سوال کا دوسرا جزو یہ ہے" سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعۃً ایاک نعبدُ سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے" کیا خوب! اعتراض صاحب جس کو اندازِ تخاطب کا بدل جانا کہ رہے ہیں عرفِ علم و معانی کی اصطلاح میں اس کو التفات کہتے ہیں۔ یہ التفات چھ قسم کا ہوتا ہے تمام معانی و بیان کی کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ اس کی مثالیں اور تعریفیں مذکور ہیں اور وہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ التفات سے کلام کا معیار

بلاغت کتنا اونچا ہو جاتا ہے۔ تمثیلاً آپ یوں سمجھیے کہ ایک مقرر کسی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے پہلے سب کو متکلم کی ضمیر جمعی "ہم" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے "ہم یوں ہی اسی طرح پستی میں پڑے ہوئے ہیں" پھر جب سامعین اس کی طرف ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ جاتے ہیں، تو اب وہ بجائے "ہم" کے لفظ "تم" یعنی ضمیر خطاب سے لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے "تم لوگ آہ کتنے بے خبر ہو!" علماء معانی و بیان لکھتے ہیں کہ کلام میں اس طرح تنوع اور تفنن کے پیدا ہو جانے سے بہت زور پیدا ہو جاتا ہے۔ پس یہی حال سورۂ فاتحہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ تلقین کرتا ہے کہ وہ کس طرح اس کی حمد کریں۔ کس طرح اس سے مدد مانگیں اور کیوں کر اس کی بارگاہ میں دعائیں کریں۔ چوں کہ مقصود تلقین و تعلیم تھا، اس لیے بہتر سے بہتر اندازِ بلیغ کے ساتھ مسلمانوں کو تلقین کی گئی۔ اسی میں التفات سے بھی کام لیا گیا مگر اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سورۂ فاتحہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلی تھی۔ آہ افسوس!

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

۹۔ اعتراض ۹ کا جواب نمبر ۶ کے جواب میں آچکا ہے، مگر اس میں نیاز صاحب نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں "قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفارِ مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ (؟) پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا جیسا کہ عام عقیدہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی

حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے، جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔" سبحان اللہ! ذرا اس عبارت کو بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ اس کے لفظوں میں باہمی ربط اور جملوں میں منطقی ترکیب کیا ہے؟ گویا تاریخی کتابوں میں واقعات آئندہ سے متعلق پیش گوئی بھی ہوتی ہے۔ آج فن تاریخ سے متعلق یہ ایک نیا انکشاف ہوا ہے۔

۱۰۔ آپ کیا کہتے ہیں، یہ تو ہم خود کہہ رہے ہیں کہ جس طرح خدا کے لیے سمع و بصر ہے، مگر اس کی حقیقت وہ نہیں، جو ہمارے سمع و بصر کی ہے، اسی طرح خدا کے لیے کلام کی صفت بھی پائی جاتی ہے، مگر اس کے لیے وہ ہماری طرح زبان اور کام و دہن کا محتاج نہیں، لیکن اس کے باوجود جس طرح اس کو سمیع و بصیر کہا جاتا ہے، اسی طرح اس کو متکلم اور اس کے ارشادات کو اس کا کلام کہا جائے گا۔ عجیب ژولیدہ دماغی ہے کہ ایک طرف تو آپ خدا کی صفات کے قائل ہونے کے باوجود ان کے لیے مادی کیفیات نہیں مانتے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اگر قرآن کو خدا کا کلام کہا گیا، تو اس سے لازم آجائے گا کہ خدا کے لیے زبان بھی مانی جائے حالاں کہ لیس کمثلہ شیئ۔

اِن دس سوالات کے بعد نیاز صاحب لکھتے ہیں: "یہ ہیں چند من جملہ اور شبہات کے جن کی بنا پر میں قرآن کو منطوقِ خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں" تو گذارش یہ ہے کہ اگر آپ کو قرآن پاک کے "منطوقِ خداوندی" سمجھنے سے مجبوری ہے، تو ہوا کرے، لیکن اب جب کہ آپ کے ان سوالات کے شافی جوابات دے دیے گئے ہیں، تو قرآن مجید کو "کلامِ خداوندی" تو سمجھیے! اس میں اب کیا اشکال باقی رہ گیا ہے؟

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مَیں نے اپنی تحریر کو اتمامِ حجت کے طور پر صرف نیاز صاحب کے دس سوالات کے جوابات تک محدود رکھا ہے، ورنہ قرآن مجید سے متعلق اُن کی سب تحریروں کو سامنے رکھ کر گفت و گو کی جائے، تو بڑی آسانی سے یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ نیاز صاحب چند سطروں میں ہی کس قدر متضاد و متناقض باتیں کہ گئے ہیں، جن سے اُن کی تشویشِ دماغی کے علاوہ علوم و فنون سے افسوس ناک بے خبری کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ اگر نیاز صاحب علمِ کلام اور فلسفہ سے واقف ہوتے، تو کچھ اور نہیں، کم از کم اپنی بات بنانے کے لیے ہی قرآن مجید کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے سے متعلق معتزلہ کے عقائد باطلہ اور اُن کے کم زور دلائل ہی کی پناہ لے سکتے تھے، مگر یہاں تو یہ عالم ہے!

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رُسوا تیرا!

("برہان")

مُدیرِ "نگار" سے

(جناب حکیم محمد حسین صاحب عرشی "مدیر البیان" امرتسر)

آپ کے دس سوالوں کے جواب سے پہلے چند باتیں بہ طور تمہید عرض کرتا ہوں۔ آپ کے اعتراضات کی بنیاد بہت کچھ عقیدۂ قدامتِ قرآن اور لوحِ محفوظ پر ہے، لیکن آپ یقیناً اس سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ لوحِ محفوظ کا مروّجہ مفہوم زمانۂ روایت کی ایجاد ہے جس کو قرآن سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ باقی رہا عقیدۂ قدامتِ قرآن، تو اس کا وجود زمانۂ نزولِ قرآن میں تو کجا زمانۂ روایت میں بھی نظر نہیں آتا۔ پھر اس کمزور بنا پر کھڑی کی گئی عمارت کہاں تک پائے دار ہو سکتی ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ ہر مذہب کے پیروؤں میں روایت پسند لوگ بہ کثرت ہوتے ہیں، ان کے غیر محققانہ معتقدات کو بنائے اعتراض قرار دینا اور نفسِ مذہب کو مطعون کرنا اخلاق اور دیانت کے خلاف ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"یہ رسولؐ کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو"۔ ۔ ۔ "رسولؐ کی عظمت کا اقتضا یہی ہے کہ قرآن کو انہی کا کلام سمجھا جائے"[1]۔ ۔ ۔ "یہ استعارتاً کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کا قول گویا عین خدا کا ارشاد ہے"[2]۔

---

[1] "نگار" جولائی ۱۹۴۶ء ص ۶۴ و ۶۵۔ [2] "نگار" اگست ۱۹۴۶ء ص ۶۲۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ قرآن مجید کو قابلِ استناد سمجھتے ہیں اور اپنے مضامین میں جا بجا آیاتِ قرآنی سے استشہاد فرماتے ہیں۔ میں بھی قرآن سے اور ضمناً عقلی دلائل سے استمداد کروں گا۔ سورۂ مدثر میں ارشاد ہے:

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝	قرآن کو قولِ بشر کہنے والا جہنم واصل کیا جائے گا۔

پھر سورۂ معارج میں فرماتے ہیں:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝	اگر پیغمبرؐ ایک قول بھی اپنی طرف سے گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرے، تو اس کی شاہ رگ کاٹ دی جائے۔

یہاں لفظ قول (جمع اقاویل) ہے، جو بہ اتفاقِ اہلِ لغت مجموعہ ہے لفظ ومعنی کا، نہ کہ مجرد معنی، بلکہ اس میں لفظیت معنویت پر غالب ہے ——

اگر آپ کی تحقیق صحیح سمجھ لی جائے، تو کفارِ عرب کی رائے کی تردید کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ اَكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا[۱]۔ وغیرہ ذٰلک من الآیات۔ یعنی یہ قرآن محمدؐ کی اپنی تصنیف ہے۔ اس لحاظ سے کیا یہ سمجھنا صحیح ہوگا کہ رسول اللہؐ کی حقیقی عظمت کو کفار نے سمجھا اور مسلمانانِ قرنِ اول سے اس وقت تک اس "عظمت" کا احساس نہ کر سکے؟ بلکہ خود رسول اللہؐ بھی اپنی اس "عظمت" سے بے خبر تھے، جس کو آپ "نگار" کے صفحات میں بکھیر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ	اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی تبدیلی کرنا بھی میرے

۱؎ الفرقان ۵۔

تِلْقَآئِ نَفْسِیْ (یونس-۱۵) | بس کی بات نہیں۔

چہ جائیکہ سارے کا سارا از خود تصنیف کروں؟

پھر یہ جو ہر صفحہ اور ہر سطر میں خداوند تعالیٰ بہ حیثیت متکلم جلوہ گر نظر آتے ہیں اور بار بار اِنَّا، نَحْنُ، جَعَلْنَا، خَلَقْنَا، قُلْنَا وغیرہ کہا گیا ہے اور مخاطب محمدؐ یا دوسرے انبیاء ورسل ظاہر کئے گئے ہیں، اس کا کیا مطلب سمجھا جائے؟ کیا یہ سب ملہمین علیہم السلام خود ہی متکلم اور خود ہی مخاطب بن کر:

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ"

کے فریب میں قوم کو مبتلا کرتے تھے؟ معاذ اللہ! آپ کہتے ہیں، استعارتاً قولِ رسولؐ کو گویا قولِ خدا کہا جا سکتا ہے۔" یہ "استعارتاً" تو باطنیہ اور قادیانیہ سے بھی زیادہ قرآن سے دوری کا مظہر ہے۔ اس سے آپ کی نیت اور عربیت دونوں کے چہرے سے پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ اس سے تو یہ زیادہ آسان ہے کہ آپ پادریوں اور آریوں کی صف میں کھڑے ہو کر کہہ دیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود قرآن تیار کر کے مصلحتاً خدا کے ذمے لگا دیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"وحی والہام کا لفظ کلامِ مجید میں ہر جگہ فطری ذہانت وانتقاد یا طبعی صلاحیت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے[۱]"۔

میں عرض کرتا ہوں کہ "نگار" اور "صدق" کے مضامین کو بھی کیوں نہ کلام اللہ تسلیم کر لیا جائے؟ یہ بھی تو آپ کی اور مولوی عبدالماجد صاحب کی "فطری ذہانت وانتقاد اور طبعی صلاحیت" کا نتیجہ ہیں۔ تمام شاعروں کے دیوان اور تمام مصنفوں

---

[۱] "نگار" اگست ۱۹۶۲ء ص ۶۲۔

کی تصنیفیں بے تکلف کلام اللہ کیوں نہ مان لی جائیں؟ اس میں قرآن کو کیا امتیاز رہا؟ اور وہ تحدی کہاں گئی کہ اس کی مثال بنانے سے جن و انس قاصر ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں لفظ وحی و الہام بہت وسیع معنی میں مستعمل ہوا ہے لیکن وسیع معنی میں مستعمل ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ اظہار خصوصیت کے لیے بھی اس کو خاص معنی میں نہ سمجھا جائے۔ آپ نے خود تسلیم فرمایا ہے کہ الہام و وحی کا استعمال بری باتوں کے لیے بھی کیا گیا ہے[۵۱] یعنی آپ وحی کے برے بھلے استعمال کے فرق کو تسلیم فرماتے ہیں۔ شیطانی وحی، نحل کی وحی اور ام موسیٰ ع کی وحی میں یقیناً فرق ہے۔ پھر خدا کی وحی اپنے منتخب بندے کی طرف تمام عالمِ انسانی کی دائمی ہدایت کے لیے کیوں نہ ان تمام وجہوں سے ممتاز سمجھی جائے؟ چنانچہ یہ حقیقت بھی خود قرآن مجید نے کھول دی ہے:

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۱ط (جن)	"اور اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔"

یعنی یہ وحی بہ خلاف عام وحی کے قطعاً محفوظ ہوتی ہے۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○ (حٰمٓ۔ ۴۲)	باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ نبی ص کے عوارضِ بشریہ پر غیر مرئی پہرے بٹھا دینے کے بعد قرآنی وحی نازل ہوتی تھی، یعنی اس میں بشری جذبات اور حالات سے متاثر ہونے والی بشری عقل کا قطعاً دخل نہیں ——— خود نبات کے معنی ازروئے قرآن ہر قسم کی خبر کے ہیں۔ کما قال:

---

[۵۱] "نگار" جولائی ۱۹۶۰ء ص ۶۲۔

جِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍۭ بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ (النمل - ۲۲)	ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ میں شہر سبا سے ایک یقینی خبر (نباء) لے کر آیا ہوں۔

اسی طرح "رسول" کا لفظ عام قاصد پر بولا گیا ہے :

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ (یوسف)	جب بادشاہ کا قاصد یوسف کے پاس گیا۔

کیا اس وسیع استعمال سے نبی اور رسولؐ کی خصوصیّت کو عمومیت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ خود لفظ "الٰہ" کا استعمال غیر اللہ پر قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کو کلام اللہ مان لینے سے آپ کو یہ خطرہ درپیش ہے کہ "رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکیے کی سی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے[1]"۔ شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مومنین و صلحاء کی طرح محلِ ابتلا و سوال میں تھے، جس پر بہت سی آیات شاہد ہیں۔ مثلاً :

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ - (الانبیاء ۲۳)	اللہ تعالیٰ پر کوئی سوال نہیں کر سکتا، باقی سب سے بازپرس ہوگی۔

آپؐ اوامر و نواہی کے پہلے مکلّف تھے۔ وقت و حالات کے مطابق فصلِ خصومات، تہیّۂ اسباب، تدبیرِ مملکت وغیرہ آپؐ کے ذمّے تھے، یعنی آپؐ کی بشری عقل کے ذمّے۔ جس میں دوسرے نیک حکّام کی طرح آپؐ سے خطا و ثواب دونوں کا صدور ممکن ہوتا تھا۔ ساڑھے تیرہ سو سال میں مسلمانوں میں ایک فرقہ یا ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا، جو رسول اللہؐ کو عقل و ارادہ سے خالی

---

[1] نگار، جولائی ۱۹۴۰ء۔

سمجھتا ہو۔ پھر آپ کس کی اصلاح کے لیے ایک عالم گیر مسلّمہ کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر رہے ہیں، جس کو مان کر رسالت، رسالت رہتی ہے نہ الوہیت، الوہیت؟

بعض علماء جس لہجے میں آپ کو خطاب کر رہے ہیں، یہ لہجہ یقیناً قرآنی تعلیم کے منافی ہے، لیکن آپ کو بھی اتنا بڑا اختلاف شائع کرنے سے پہلے مخلص علماء سے مکالمہ و تبادلۂ خیال کر لینا ضروری تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی تحریر بے اثر نہیں ہوتی۔ اس صورت میں اگر آپ غلطی میں مبتلا ہوئے (جو محال نہیں)، تو آپ کے ساتھ کتنے اور شخص غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے اور اس کی حقیقی ذمہ داری آپ کی تنہا ذات پر ہو گی۔ واعاذنا اللہ منہا۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جانست

میری گذارشات پر آپ یا آپ کے کوئی ہم خیال صاحب اظہارِ خیال فرمائیں گے تو میں شکریے کے ساتھ اس کو "البیان" میں شائع کروں گا اور تسلیمِ حقیقت میں درنگ نہیں کروں گا۔ اِن شاءاللہ۔

ایک بات اور یاد آ گئی، ذرا اس کی تشریح فرمائیں، کیا فطری "ودیعت و ذہانت" کے بل پر ایسی پیش گوئیاں کرنا ممکن ہے، جو وحی کے نام سے پیش کی گئیں اور پوری ہو کر رہیں؟ مثلاً:

۱۔ ایک غلام قوم کی اَن پڑھ عورت اُمِ موسیٰ علیہما السّلام کو وحی ہوتی ہے کہ "چند دن کے شِیرخوار بچّے کو دریا میں ڈال دے، ہم ضرور اُسے بچائیں گے اور پھر تیرے پاس لائیں گے"، یہ وحی ہے اور ساتھ ہی اس کے پورا ہونے کا یقین دل میں راسخ کر دیا جاتا ہے، ورنہ دنیا کی کوئی صحیح دماغ عورت محض فطری

ذہانت کے بل پر اپنے پیارے بچے کو دریا میں ڈالنے کی جرأت یقیناً نہیں کر سکتی۔

۲۔ یا مثلاً "غُلِبَتِ الرُّوْم" والی پیش گوئی، شکست خوردہ اہل روم جو ابھی ابھی اپنی قوت کی بے چارگی کو آزما کر حوصلوں اور ارادوں کو پست کئے ہوئے بیٹھے ہیں، جن کو اپنے مستقبل سے متعلق خود کچھ نہیں سوجھ رہا، ان کے متعلق ایک صحرا نشین ؐ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ اہلِ روم کی شکست صرف چند سال میں فتح میں تبدیل ہو جائے گی۔ آخر ایسا ہو کر رہا اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ پیش گوئی کرنے والا شخص ؐ سکندر کا سیاست فہم استاد ارسطو یا نوشیرواں کا فاضل وزیر بزرجمہر نہیں تھا، بلکہ عبد اللہ کا اُمّی بیٹا محمد (صلوات اللہ علیہ)۔

۳۔ یا پوری قوم کے مقابلے میں ایک بے کس اور بے سروسامان شخص کے عروج و اعتلا کی پیش گوئی، مخالفت کے طوفانوں میں وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا) کی بشارت، پھر یہ بھی غور کریں کہ ایسی بے شمار آیات میں متکلّم و مخاطب ایک ہی ہے یا دو؟ اور اگر دو ہیں، جو حقیقتاً صحیح ہے، تو وہ کون ہیں؟ اور ایسی ہی بہت سی پیش گوئیاں جن کی تفصیل قرآن مجید، کتب سیرت اور تفاسیر میں مرقوم ہے۔

پھر اگر یہ فطری ذہانت تھی، تو معلوم ہوا کہ اختیاری چیز تھی۔ پھر اس کے رُک جانے سے پیغمبر ؐ کی پریشانی کیا معنی رکھتی ہے؟ اور

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ (ضحیٰ ۳)	(اے محمدؐ!) تمہارے پروردگار نے نہ تو تمہیں چھوڑا اور نہ (تم سے) ناراض ہوا۔

اور :

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (الضُّحٰی)	اور عنقریب تمہیں تمہارا پروردگار وہ کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

کا کیا مطلب ہے؟

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ (طٰہٰ)	نزولِ وحی ختم ہونے سے پہلے قرآن کے نا تمام حصوں کو پڑھ کر سنا دینے میں جلد نہ کر!

اور :

اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (القیٰمۃ)	اس (قرآن) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔

کی کیا توجیہ ہے؟

اب آپ کے دس سوالوں کا جواب اختصار و جامعیت کو مدّ نظر رکھ کر عرض کرتا ہوں :

س ۱۔ قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے؟ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا، حالاں کہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اوّل صورت مانی جائے، تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا، لیکن "شئے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شیئٍ ھالك الّا وجھه" اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لیے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا"

ج ۔ قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے :

(۱) جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (الزخرف ۳)	ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا۔

خدا کے ساتھ کوئی چیز از خود وجود میں نہیں آئی۔

۲۔ كُلُّ شَيْءٍ خَلَقَهُ	ہر شے اس کی مخلوق ہے۔

ہلاک کے معنی خواہ مخواہ عدم محض ہی کیوں لیے جائیں؟ الهلاك على ثلاثة كقوله افتقاد الشئ عنك وهو عند غيرك موجود كقوله تعالىٰ هلك عنى سلطانيه وهلاك الشئ باستحالة او فساد كقوله يهلك الحرث والنسل ويقال هلك الطعام الخ (راغب)۔[1]

آپ کو کلام اللہ کی فنا کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے، حالاں کہ قرآن مجید اور اب عہدِ جدید کا سائنس بھی دونوں بالاتفاق پکار رہے ہیں کہ کوئی ارادی یا غیر ارادی حرکت اور کوئی آواز خواہ وہ کسی انسان کے منہ سے نکلے یا حیوان کے گلے سے، کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق)	انسان کے منہ سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ ایک (غیر مرئی) نگران کی گرفت میں آجاتا ہے۔
إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الجاثیہ ۲۹)	اے بنی آدم! ہم لکھتے جا رہے تھے، جو کچھ کہ تم کرتے تھے۔

کیا آپ غور نہیں فرماتے، تاریخ کے تاریک ترین عہد میں، دنیائے علم و

---

[1] هلاك کے تین معنی ہیں: ۱۔ کوئی شے جو تم سے کھوئی جائے اور کسی دوسرے شخص کے پاس موجود ہو جیسا کہ قرآن میں ہے: "هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ" میرا غلبہ جاتا رہا۔ ۲۔ کوئی شے فاسد و خراب ہو جائے، جیسے فرمایا: "يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ" کھیتی اور نسل ضائع کرتا ہے۔ اور ۳۔ "هلك الطعام" کھانا خراب ہو گیا۔ (راغب)۔

تہذیب سے بعید ترین گوشے میں ایک اَن پڑھ شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لبِ مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور آج علم و تجربہ کی ترقیاں مشرق و مغرب کے کونے کونے میں پکار پکار کر اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ کیا فاطر السمٰوٰت والارض کے سوا کسی میں طاقت ہے کہ ایک مبرہن حقیقت کو اس کے عالم آشکارا ہونے سے ۱۳ صدیاں پہلے ایسے بلیغ الفاظ میں بیان کر دے کہ ہر زمانے کے لوگ اس پر مطمئن ہوتے رہیں، یہاں تک کہ وہ آفتاب بن کر سامنے آجائے؟ اور یہ آپ نے کیا کہا، فنا ہو جانے والی چیز، خدا کا کلام نہیں ہو سکتا؟ کیا آپ کے اس اصول سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا، فنا ہو جانے والے حیوان، نبات، جماد وغیرہ خدا کی مخلوق نہیں ہو سکتے؟[1]

س ۲۔ "اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا، جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں، جو پریس کے ذریعے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں ضائع ہو جائے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔"

ج۔ نیاز ایسے ہوش مند انسان کے قلم سے یہ اعتراض دیکھ کر ——— سلامت قلب و دماغ کا نوحہ کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر آپ خدا کو مانتے ہیں، تو میں یہ پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ اس دنیا میں کون سی چیز ہے، جو خدا کی نہیں؟

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (بقرہ ۱۶)	آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اُسی کا ہے ———

ستارے ٹوٹ جاتے ہیں، حالاں کہ وہ براہ راست خدا کی چیز ہیں۔ بڑے

---

[1] حالاں کہ معدومیت یہاں بھی مراد نہیں۔

بڑے انسان بڑے بڑے طویل دُکھ اُٹھا کر عین عالمِ شباب میں اِس دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، حالاں کہ وہ خدا کے دو ہاتھوں کی مخلوق ہیں۔

خلقت الادم بیدیّ۔ | میں نے آدم کو اپنے دو ہاتھوں سے بنایا۔

اس لحاظ سے کہ ہر چیز محلِ تغیّر میں ہے، تمام کائنات الٰہیہ فانی ہیں۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ | زمین کی ہر چیز فانی ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ۔ | وجہ الٰہی کے سوا ہر شے ہالک ہے۔

اور اس حیثیت سے کہ یہ کارخانہ قطعی اور یقینی نتائج سے وابستہ ہے، کوئی آواز، کوئی حرکت، کوئی ذرّہ بھی معدوم نہیں ہوگا:

مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔ | یہ تمام تخلیق باطل نہیں ہے۔

یعنی، تخلیق کا کوئی اونٹے سے اونٹے جز بھی باطل و رائگاں نہیں اور جو چیز باطل و رائگاں نہیں، وہ لازماً حق و ثابت ہوگی۔

س ۳۔ "اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے، تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصوّر کیا جائے یا صفاتِ خداوندی میں شامل کیا جائے، قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے، یعنی، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے، اس لیے لامحالہ اسے "صفت ربانی" ماننا پڑے گا، لیکن چوں کہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جُدا نہیں ہے، اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ، یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔"

ج۔ نہیں صاحب! صفت اور نتیجہ صفت دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان کو مخلوط نہ کریں۔ کاتبؔ، صاحبِ صفت۔ کتابتؔ، صفت اور مکتوبؔ، نتیجہ

صفت ہے۔ ان تینوں کے فرق کو سمجھیں۔ کتابت جو کاتب کی صفت ہے، وہ تو بے شک کاتب سے الگ نہیں ہو سکتی، لیکن مکتوب جو صفتِ کتابت کا فعلی نتیجہ ہے، اس کو کاتب کی ذات کے ساتھ نہیں چپکایا جا سکتا۔ اسی طرح ہر صانع کی صنعت بہ حیثیت صفت اس کی ذات میں داخل ہے اور مصنوع جو اس کی صنعت گری کا فعلی نتیجہ ہے، اس کی ذات سے خارج ہے۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفاتِ حسنیٰ کی طرح اپنی شان کے مطابق کلام کرنا ایک صفت ہے جو داخلِ ذات ہے، اور جس طرح دوسری صفات کے مظاہر و نتائج جیسے رازقیت سے رزق، داخلِ ذات نہیں ہو جاتا، اسی طرح کلیمیت سے کلمات کو شاملِ ذات نہیں سمجھا جا سکتا۔

س ۴: "اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آں حضرت تک پہنچایا گیا تھا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا، جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں، جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے، جو بالکل محال ہے۔"

ج۔ خدا تعالیٰ "موجود ہے" زید بھی "موجود ہے" کیا صفتِ موجودیت میں زید خدا تعالیٰ کا مماثل قرار پائے گا؟ قرآن مجید میں کئی ایک صفات سمع و بصر وغیرہ انسان اور خدا میں بہ ظاہر الفاظ مشترک فرمائی گئی ہیں، جن پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس سمع اور اُس سمع کے فرق کو آپ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں، یعنی انسان کی نہ صرف سماعت و بصارت و نطق، بلکہ ہر قوت

ایسے بے شمار آلات واسباب کی محتاج ہے جن پر انسان کو قدرت وتصرف حاصل نہیں مثلاً بصارت کے لئے آنکھ کی ضرورت ہے اور اس آنکھ کے پیچھے تمام نظام دماغی وجسمانی کی، جس کو انسان نے اپنی مرضی سے مرتب نہیں کیا، ضرورت ہے، لیکن اس پر بھی یہ کچھ نہیں دیکھ سکتا، اگر خارجی مناسبات مصنوعی و قدرتی روشنیاں وغیرہ اپنے لاانتہا معاونوں سمیت آمادۂ کار نہ ہوں اور یہ سب کچھ انسان کے بس کی چیزیں نہیں ہیں، لیکن خدا تعالےٰ کے "بصیر" ہونے کو اگر اسی پر قیاس کرلیا، تو خود "بصیر" کہنے والی کتاب سے ہم بہت دور جا پڑیں گے، جو ہمارے ذہن وادراک پر لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ[1] کا ڈھکنا رکھ کر ہماری حد مقرر کردیتی ہے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ ہم اپنے ہر فعل وقول اور ہر حرکت وسکون میں سارے نظام کائنات کی مدد کے محتاج ہیں

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	آسمان وزمین کی تمام مخلوق تمہارے کام میں لگادی گئی ہے۔

اور یہ سارا نظام کائنات اپنے وجود اور فعلیت میں اللہ تعالےٰ کا محتاج ہے

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الرحمٰن ۲۹)	آسمان وزمین میں جو کوئی ہے، اُس کے در کا سوالی ہے۔

قرآن کے نزدیک خدا نے ہر چیز کو اس کے حسب حال گویائی عطا فرمائی ہے

اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰمٓ ۲۱) اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کو ناطق بنایا۔

---

[1] خدا کی مانند کوئی شے نہیں، بلکہ مثل کے ساتھ کاف تشبیہ لاکر مضمون کو اور زیادہ بلند کردیا، جس کو علم وذوق کے مطابق سمجھا جاسکتا ہے۔

اور انسان کو ایسی گویائی اور عقل دی کہ اُس نے خدا کی دی ہوئی قوتوں کے بَل پر اپنی گویائی کو غیر ذی روح، مادی اشیاء، کتابوں، موسیقی کے آلات، ریڈیو وغیرہ میں منتقل کر دیا۔ آپ انسان کی یہ قدرت تو ماننے کے لیے مجبور ہیں، لیکن نطق کے حقیقی سرچشمہ، تمام قدرتوں اور قوتوں کے اصلی مالک کے متعلق اپنے محدود علم و واقفیت کی بنا پر گرفتارِ شبہات ہیں ——— حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں شاہِ مصر کو مشہور خواب آتا ہے، جس سے آنے والے قحط کے زمانے میں بے شمار مخلوق کو فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کو یہود، نصاریٰ اور مسلمان متفقہ طور پر مانتے ہیں۔ جب وہ خواب کے ذریعے اپنا منشاء بندوں پر ظاہر کر سکتا ہے تو کسی دوسرے ذریعہ سے جس کو اصطلاح میں "جبرئیل" کہا جاتا ہے، اس کو کون سا امر مانع آتا ہے؟ آخر یہ تمام ذرائع اس کے مخلوق اور خادم ہی تو ہیں ——

تاریخ کے دفاتر اور انسانی زندگیوں میں بے شمار شہادتیں ملتی ہیں کہ انسانی خوابوں میں اشکال و الفاظ کے ذریعے ایسے پیش آئندہ واقعات بتائے گئے، جو حرف بہ حرف پورے ہوئے، حالاں کہ ان میں انسانی فکر و ارادہ کو قطعاً دخل نہ تھا۔[1] سچے خوابوں کو نبوّت کا چالیسواں حصّہ کہتے ہیں۔ یہی نکتہ مضمر ہے، انسانی عقل اپنی تمام علمی ترقیوں کے باوجود اس چالیسویں حصّے کی ماہیت ابھی تک نہیں سمجھ سکی، نبوّت کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے شاید مزید ۴۰ صدیوں کی ضرورت پڑے۔

---

[1] میرے ایک شناسا کی بیوی کے علاج سے معالج عاجز آچکے تھے۔ مریضہ کو خواب میں ایک نسخہ کے اجزا اور ترکیب استعمال بتائی گئی۔ اس عمل سے چند روز میں صحت

س ۵۔ قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا، وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظِ ترتیب مختلف ہے، جو لوحِ محفوظ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پزیر چیز حادث ہے، حالاں کہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیے "

ج۔ الفاظ کے حدوث میں آپ راستی پر ہیں۔ خود قرآن مجید اپنے آپ کو بارہا محدث و حدیث وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے:

۱۔ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ (الشعراء ۵)	اور اُن کے پاس (خدائے) رحمٰن سے کوئی نئی نصیحت نہیں آتی مگر یہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔
۲۔ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا الخ (الزمر۔ ۲۳)	خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب۔

س ۶۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے، یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب ﷺ پر نازل ہوئی ہے، جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا، بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے

تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں، گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں"

ج - آپ کا یہ اعتراض غیر قرآنی روایتی عقیدہ کی بنا پر ہے، جو عند القرآن مسلّم نہیں، یعنی "لوحِ محفوظ" کوئی ایسی لکڑی وغیرہ کی بنی ہوئی تختی نہیں، جو آسمان کے کسی مقام پر آویزاں ہے اور اس پر قرآن مجید ازل سے لکھا ہوا ہے اور نہ روایتی شانِ نزول کی کوئی مسلّمہ حقیقت ہے۔ قرآنی آیات اپنی شانِ نزول کو جا بہ جا حسبِ موقع و محل خود واضح کرتی جاتی ہیں روایات کے لحاظ سے ایک ایک آیت کی متعدد شان ہائے نزول بتائی جاتی ہیں، جن میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ کذا قال الشاہ ولی اللہ الدہلوی وقیل اضرّ الاشیاء فی تفسیر القرآن شان النزول[1]۔ تفسیر قرآن میں مضر ترین چیز شان نزول کہی گئی ہے۔

س ۷ - "اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا، تو پھر اُن آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو لفظِ قُلْ سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" در آں حالیکہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی، جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے؟ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟"

---

[1] بحوالہ بلغۃ الحیران فی ربط آیات القرآن صفحہ ۴

ج ۔ مذکورۃ الصدر بیان کی روشنی میں یہ اعتراض بے جا ہے۔

س ۸ ۔ اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے، تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر مالکِ یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے، گویا مخاطب سامنے نہیں اور پھر دفعتاً "ایاک نعبد" سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی، تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا۔"

ج ۔ اگر خدا کا کوئی دوسرا خدا ہوتا، جو اُس سے زیادہ بابرکت اور اوّلیت کا اہل ہوتا، تو آپ کا مطالبہ پورا کیا جا سکتا تھا۔ آپ غالباً خدا تعالےٰ سے انسانی انکسار و تواضع کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ خدا کہ صرف اُسی پر جبّار و متکبّر وغیرہ الفاظ بالکل صحیح طور پر چسپاں ہوتے ہیں۔ اگر اپنے متعلق ایسے الفاظ کا استعمال نہ کرے، تو ان مفہومات کی تعبیر کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اگر آگ، پانی، مٹی وغیرہ کے صفات و خواص صاف صاف بیان کرنا ہمارے لیے بے حد مفید ہے، تو صفاتِ الٰہیّہ کا ممکن ادراک کیوں اس سے بھی زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ "خود اپنی ذات سے خطاب کرتا ہے"، مَیں پوچھتا ہوں،

کہاں؟ آپ کو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وغیرہ سے مغالطہ ہوا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ سارا قرآن انسانوں کی تعلیم کے لیے ہے اور اُن کے کام کی چیز ہے۔ کہیں کہیں دعائیہ فقرے "قُلْ" یا "یَقُوْلُوْنَ" وغیرہ الفاظ کے بعد لائے گئے ہیں، لیکن اکثر جگہ ایسے الفاظ کو مقدر رکھا گیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: "مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے" حالاں کہ یہ دُعا کا انداز ہی نہیں۔ اس میں بعض خاص صفاتِ الٰہیہ تعلیم کی گئی ہیں، جس سے دعا کرنے والے کے ذہن میں پہلے سے یہ یقین پیدا ہو جائے کہ مَیں جس دربار میں سوالی ہو رہا ہُوں، وہ کامل مطلق اللہ، تمام خوبیوں کا مالک، کل عوالم علوی و سفلی کو تربیت و پرورش سے مستفید کرنے والا، رحمٰن، رحیم اور قانونِ جزا کے مالک کا دربار ہے ——

انسان طبعاً حصولِ کمالات کی بے اندازہ تمناؤں کا مجموعہ ہے، اور یہ بے شمار مخالف و موافق سامانوں سے معمور کائنات اور باندازہ طلب اس کی مراد برآری سے قاصر،

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

اس کی کمال طلب فطرت ایک کامل مطلق ہستی کی سخت آرزومند ہے، لیکن عقل و حس سے اس کو پا نہیں سکتی، جس طرح حیات کی تمام بنیادی ضروریات حیات آفریں نے بے سعی اس کے سامنے رکھ دی ہیں، لازم ہے اسی طرح اپنے جمالِ معنی سے خود نقاب سرکائے اور بذریعہ وحی اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا کے عرفان میں مدد کرے تاکہ انسان تسلی پائے کہ جس ذات نے اس کے اندر طلبِ کمال پیدا کی ہے، اُسی نے حصولِ کمال کے ذرائع بھی تیار کر رکھے

ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے پیاس سے پہلے پانی اور بھوک سے قبل کھانا موجود کر دیا ہے، بلا تشبیہ قصائد میں مدح التجا پر مقدم ہوتی ہے، یعنی شاعر پہلے مخاطب کی مدح پر زورِ طبیعت صَرف کرتا ہے۔ اس میں غائب و حاضر کی قید نہیں ہوتی۔ پھر بہ طریقِ التفات خطاب کر کے اظہارِ مدعا کیا جاتا ہے یہی انداز اس سورہ فاتحہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ ایسے "دیانندیانہ" اعتراض کرتے ہیں، جو ایک ماہرِ اسالیب کو زیب نہیں دیتے۔

لوحِ محفوظ اور کتابِ مکنون صحیفۂ فطرت ہے۔ اس کے ہر ہر ذرہ کی محفوظیت اور اس کے اسرار کی مکنونیت میں کسی مذہبی بلکہ دہری تک کو بھی کلام نہیں۔ قرآن مطابق فطرت ہے، لہٰذا اس کے بیان کردہ حقائق توحید، اعمال قانونِ جزا وغیرہ صحیفۂ فطرت میں موجود ہیں۔ حقائق خدا کے ساتھ قدیم اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور اس سے خدا کی وحدت فی القدم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مسلمات ریاضی کی ابدیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

س ۹ ۔ قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے، مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے، جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی

کی گئی ہے۔ دراں حالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔"

ج۔ اس کا جواب ہو چکا۔ آپ اپنے سوالات میں بار بار ایک بات کو دہراتے ہیں اور آپ کی تان ہر پھر کر اسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ میں قدیم نہیں ہے، حالاں کہ آپ جس عمارت کو ڈھانا چاہتے ہیں، اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

س ۱۰۔ خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفتِ نطق کا ذکر کیا جائے، تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو، جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لیے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لیے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہیے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔"

ج۔ یہ بھی لفظی اُلٹ پھیر ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ وہ تمہیں روشنی پہنچانے میں سورج کا محتاج ہے۔ ہماری پیاس بجھانے میں پانی کا محتاج ہے وقس علیٰ ہذا۔ ٹھیک اسی طرح ہماری رہ نمائی میں الفاظ کا محتاج ہے۔ حضرت! یہ عالمِ اسباب ہے، وہ خالقِ اسباب و مخدومِ اسباب ہے۔ وحی کی ایقانی کیفیت تزکیہ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ہمیں علم نہ ہو، اس کا انکار کر دینا ہمارے کھلے ہوئے جہل کی دلیل ہے۔ ہمیں اس کی دریافت کے وہ ذرائع اختیار کرنے چاہییں، جو اس کے ماہروں نے مقرر کیے ہیں۔ ایک شاعر کس طرح شعر کہہ لیتا ہے؟ ایک موجد ایجاد پر کس طرح قدرت پاتا ہے؟ کوئی غیر شاعر یا

غیر موجد شخص اس کا ادراک نہیں کر سکتا، اس پر بھی شعر و ایجاد کی ممتاز قوت کا انکار نہیں کرتا، حالاں کہ شعر و ایجاد وغیرہ فنون بعض اشخاص میں ایک حد تک وہبی اور اس کے بعد اکتسابی ہوتے ہیں "وحی" کہ سرتاسر وہبی ہے، اسی سے کچھ نہ کچھ قیاس کی جا سکتی ہے۔ جس حقیقت کو ہم اپنی محدود واقفیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے، اس کی معدومیت کا اعلان کر دینا دُہی بات ہوئی:

گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

حقیقت ہمارے اقرار کی محتاج اور ہمارے انکار سے خائف نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ ہمارا اقرار خود ہمارے لئے مفید اور وجہ سعادت ہو سکتا ہے اور انکار میں ہماری ہی محرومی و شقاوت ہے۔ تمام دُنیوی علوم و فنون مناسب محنت و ورزش سے بہ تدریج ہمارے ذہن کے قریب آتے جاتے تھے، اسی طرح وحی کا ممکن ایقان[1] (نہ کامل علم) قرآن مجید کی بتائی ہوئی راہوں پر چلنے سے آہستہ آہستہ نفسِ انسانی میں متمکن ہو جاتا ہے وأتوا البیوت من ابوابہا گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونا چاہئے یوں الگ کھڑے ہو کر شور مچانے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ قانون فطرت کی اس شق پر بھی قرآن مجید متعدد بار روشنی ڈالتا ہے حیث قال:

---

[1] وحی (روح) کی حقیقت پہلے بھی دریافت کی گئی، تو اجمالاً جواب ملا تھا کہ روح یعنی وحی امر ربی سے ہے اور تمہارے علم کا دائرہ جو بالکل محدود ہے اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ (اعراف)

جو لوگ حق سے روگردانی کر کے زمین میں تکبّر کی ڈینگ مارتے ہیں، مَیں (خدا) ان کو اپنی آیات سے دُور کر دوں گا۔ اگرچہ وہ ہر آیت (نشانی) کو دیکھیں گے، لیکن ایمان کی لذّت سے محروم رہیں گے۔ وہ راہِ ہدایت کو دیکھتے ہوئے بھی اس پر چلنے کی توفیق نہیں پائیں گے۔ ہاں گمراہی کی راہ سے دیدہ و دانستہ مانوس رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے ہماری آیتوں کو جھٹلانے کی ٹھان رکھی ہے اور ان آیات سے اُن کا برتاؤ غافلانہ رہا ہے۔

بات بھی ٹھیک ہے۔ کوئی شخص ترکستان کی سڑک پر چل کر سامنے سے کعبے کے آجانے کی امید کس طرح رکھ سکتا ہے؟

آخری عرض یہ ہے کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق ایک خدا چاہتے ہیں، جو آپ کے قائم کردہ معیار پر پورا اترے، تو خدا، ورنہ خدائی سے معزول کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہی مطالبہ ہر شخص کرنے لگے، تو نتیجہ کیا ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۝ ۲۳/۷۱

اگر خدائے برحق لوگوں کی خواہشوں پر چلے، تو آسمان اور زمین اور جو کچھ اُن میں ہے، سب درہم برہم ہو جائیں۔

آپ کی معلومات کے اعتماد پر یہ مختصر اشارات لکھ دیے گئے ہیں حسبِ ضرورت ہر ایک کو مفصّل و مدلّل کیا جا سکتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

قرآن کیوں خدا کا کلام ہے؟

(جناب سید مقبول احمد صاحب، بی اے)

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں، ان میں سے بجز معدودے چند کے تمام نے اپنی مذہبی کتاب کو کتاب آسمانی یا الہامی یا خدا کا کلام بتایا ہے، اس لئے کسی مذہبی کتاب کا الہامی کتاب کہنے کے لیے صرف دو تنقیح طلب مسئلے رہ جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کس نے کہا؟ دوم یہ کہ کیوں کہا؟ دنیا میں آپ تمام مذاہب کی کتب کا مطالعہ شروع سے آخر تک کر جائیں، پہلے سوال کا جواب تو سوائے قرآن کے کوئی نہ دے گا، لہٰذا کوئی عیسائی، یہودی، پارسی، ہندو اگر اپنی مذہبی کتاب کے الہامی ہونے کا انکار کرے، تو وہ باوجود اس کے اپنے مذہب سے خارج نہیں سمجھا جائے گا کہ اس نے خود اپنی مذہبی کتاب کے کسی قول کی تکذیب نہیں کی، مگر قرآن کو الہامی کتاب ماننے سے انکار کرنا اس کے اسلام سے خارج ہو جانے کی کافی دلیل ہے، عام اس سے کہ ایسا منکر درحقیقت اسلام ہی سے خارج نہیں ہو جاتا، بلکہ اس نے رسول اللہ صلعم کو کاذب اور خادع سمجھ لیا ہے، جو انکار اسلام کی بدترین صورت ہے۔

دوسرا سوال "کیوں" کا ہے۔ اس کا جواب بداہت سے نہیں دیا جا سکتا، بلکہ بصیرت سے۔ علماء نے اس کے مختلف سببوں پر نگاہ ڈالی ہے۔ میں نے خود بھی اپنے دل میں سوالات پیدا کر کے اپنی عقل دوڑائی ہے۔

بہت عرصہ ہوا کہ "اسلامک ریویو" میں میں نے ایک سلسلۂ مضمون زیر

عنوان "قرآن کی مافوق العادۃ باتیں" (Supernaturalism of the Quran)
پر لکھا تھا۔ یہ تو مشکل ہے کہ میں یا "اہل البیان" اردو میں اس کا ترجمہ کرنے بیٹھیں
مگر ان مضامین کی چند بھولی بسری باتوں کا اعادہ شاید بعضوں کے لیے دلچسپ
اور بعضوں کے لیے قندِ مکرر بن سکے۔

میں نے قرآن کی آیتوں سے آئندہ کی پیشین گوئیاں، فلکیات، آثارِ قدیمہ
اور سائنس کے بعض ایسے اسرار پر توجہ دلائی تھی، جو تیرہ سو برس قبل کے
ایک عرب اُمّی سے بیان کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ مثلاً ہمارے بہت سے عالم اب
بھی غالباً اس سے واقف نہ نکلیں گے کہ نہ صرف عالمِ حیوانات میں نر و مادہ ہوتے
ہیں بلکہ جمادات و نباتات میں بھی اس کی کارفرمائی ہے۔ برق و مقناطیس کے مثبت
اور منفی جوڑے سے تو لوگ واقف ہو چکے ہیں کیوں کہ بغیر ان کا جوڑ ملے ہوئے آج
دنیا اندھیری رہتی۔ لیکن اُمّی عرب یہ الفاظ کہہ سکتا تھا: سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ
الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا۔ خیر قرآن کے ایک پہلو پر کسی نے نظر نہیں ڈالی اور وہ آثارِ
آدم سے متعلق ہے جو اکثر بنی اسرائیل کے قصص میں بیان کر دیے گئے ہیں اور
جس کا علم سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے علم و معرفت اور آثار کے دفتر
کھنگال ڈالے ہیں کسی دوسرے کو نہ ہوتا۔ میں نے اس کو "اسلامک ریویو"
میں (Biblical names in the Quran) کے تحت میں ایک
سلسلۂ مضمون میں لکھا تھا۔ یہ میرے ذوق کی چیز تھی کیوں کہ مجھے ابتدا سے
اسرائیلیات سے خاص شغف رہا ہے اور اسی اسرائیلیات کی جستجو نے شروع
میں مجھے قرآن سے متزلزل کر کے پھر خود بہ خود مجھے اس کے الہامی ہونے کا معترف
بنا دیا۔

پہلے میرے دل میں بھی یہ بات کھٹکتی تھی کہ بائبل کے جو قصے قرآن شریف میں بیان ہوئے ہیں، وہ جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے، رسول اللہ صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے سُن کر بیان کئے ہوں۔ بائبل کو تو غالباً انھوں نے خود کبھی نہ پڑھا ہوگا۔ کیوں کہ نہ تو وہ خود لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ بائبل ان کے زمانے میں عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اگر انھوں نے اپنی زبانی یا دداشت سے لکھی یا لکھوائی تھی، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ باتیں یا تو مدینہ میں یہودیوں سے سُنی ہوں گی، یا اپنے سفر شام میں۔ آپ کا قیام دونوں جگہ ایسی صورت میں اور ایسی تاریخ کی روشنی میں تھا کہ یہ باور کرنا بالکل لغو ہے کہ انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی ایسی صحبت یہودیوں اور نصرانیوں کی اُٹھائی ہوئی ہو کہ ان کو اپنے تمام آثار کھول کر بتلا دینے کا موقع ملا ہو۔ پھر قرآن نے طٰہٰ اور سورۃ یوسف میں جو مسلسل اور صحیح قصے موسیٰ اور یوسف علیہما السّلام کے بیان کیے ہیں کس کے مُنہ سے بجز عالم الغیب کے نکل سکتے ہیں جب عربوں کی سلطنتیں شام اور عراق میں پھیلیں اور انھوں نے یہودیوں اور نصرانیوں کے مذاہب کی معلومات حاصل کیں تو اُن سے انھوں نے اپنی حدیثیں بھرنا شروع کیں، مگر آج ان قصص کو حدیثوں میں پڑھو اور ان کا بائبل کے مضمون سے موازنہ کرو، تو تم پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ حدیث کا ایک فقیہ بھی توریت یا انجیل کی کسی روایت کی صحیح صورت پیش نہیں کرتا۔ اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کو باوجود اس شغف کے جو اُن کو اسرائیلیات سے تھا اور جس کا چرچا ہر وقت ان کی اور یہودیوں کی صحبت میں رہتا ہوگا، وہ ایک بھی صحیح قصہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب دیکھو قرآن نے نہ صرف بائبل کے واقعات کو من وعن مسلسل اور اصلی صورت میں پیش کیا ہے، بلکہ

بعض ایسی باتیں بتائی ہیں، جو اہلِ تورات و انجیل بھی عام طور سے نہ جانتے تھے، مگر وہ درحقیقت صحیح باتیں تھیں۔ ان کی میں چند مثالیں دیتا ہوں:

موجودہ بائبل میں حضرت نوح ؑ کی کشتی جس پہاڑی پر ٹھیری تھی، اس کا نام "ارارت" دیا ہے۔ یہ چوٹی اب تک اسی نام سے کہلاتی ہے، جو اس کا قدیم نام "ارارتو" تھا، مگر قرآن شریف میں حضرت نوح ؑ کی کشتی کا مستقر کوہ "جودی" ہے، جو نہ صرف "ارارت" سے مختلف ہے، بلکہ کوہِ "جودی" پہلی پہاڑی ہے، جو میدانِ عراق کے سرے پر واقع ہے اور اس کے بعد تمام کردستان اور آرمینیا میں ایک سے ایک اونچی چوٹی پہاڑیوں کے سلسلے میں چلی گئی ہے اور "ارارت" کی چوٹی ان سب سے بلند ہے اور سب سے بعد میں آتی ہے۔ آثارِ قدیمہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ طوفانِ نوح ؑ دنیا میں ضرور آیا ہے۔ یہودیوں کے قول کے مطابق یہ تمام دنیا میں آیا تھا، مگر ان کی دنیا بہت محدود تھی۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ عراق کی نشیبی زمین میں ایک عظیم الشان سیلاب آیا تھا جس نے وادیٔ دجلہ اور فرات کو پُر کر دیا تھا۔ یہ بات صرف آثارِ قدیمہ سے ثابت نہیں ہوتی ہے، بلکہ کلدانیوں کی قدیم روایتوں میں بھی اس کا ذکر ہے اور طرفہ بات یہ ہے کہ کلدانیوں کی قدیم روایتوں میں "جودی" کو مستقرِ کشتی نوح بتایا گیا ہے اور بات عقل کے مطابق بھی ہے۔ کیوں کہ عراق کی اسفل زمین کا سیلاب اگر ٹکرایا ہوگا، تو سب سے پہلی پہاڑی پر۔ رسول اللہ صلعم کو کلدانیوں کی روایت کی کیا خبر ہو سکتی تھی اور مجھے بھی اس کا علم نہ ہوتا، اگر اسمتھ اپنی کتاب "آثارِ بابل" میں اس کا ذکر نہ کرتا، یا جارج سیل قرآن کے ترجمے میں اس پر روشنی نہ ڈالتا۔

قرآن شریف میں حضرت ابراہیم ؑ کے باپ کا نام آذر آیا ہے، مگر تورات

میں اُن کے باپ کا نام تارح ہے۔ یہ بات یاد رکھو کہ عبرانی اور عربی کے تلفظ یکساں ہیں، کیوں کہ دونوں زبانیں ایک ہی اصل کی شاخ ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جو بات عربی میں آذر کہلائے، وہ عبرانی میں تارح بن جائے۔ مفسرین قرآن نے اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہوئے یہ قیاس کیا ہے کہ شاید آذر حضرت ابراہیمؑ کے اصلی باپ نہ رہے ہوں، بلکہ ابوبیت سے مراد عمومیت ہے۔ ہرگز ایسا نہیں، مگر نصاریٰ کو کیا علم تھا کہ یوسیبس (Eusebuiss) ایک قدیم نصرانی مورخ اپنی کتاب میں ابراہیم کے باپ کا نام آذر لکھ چکا ہے اور جس کا حوالہ جارج سیل نے اپنی کتاب میں اس طرح دیا ہے کہ گویا وہ یوسیبس کے قول کو صحیح سمجھتا ہے۔ یقیناً رسول اللہ صلعم نے یوسیبس کی تحریر کیا یوسبیس کا نام بھی نہ سُنا ہوگا پھر انہوں نے کہاں سے یہ لفظ معلوم کیا؟

اسی طرح بائبل میں فرعون کی جگہ "فیرو" (Pharaoh) آیا ہے۔ اگر قرآن بائبل کی نقل ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ "فیرو" کو فرعون کر دے، مگر فرعون کا لفظ اگر یہودیوں نے استعمال نہیں کیا، تو یونان کے قدیم مؤرخ ہیروڈوٹس نے استعمال کیا ہے، جس کو اس نے اپنی زبان میں "پیرون" (Peron) کہا ہے۔

یہودیوں نے قصداً فرعون کو "فیرو" بنا ڈالا ہے اور یہ ان کی عادت ہے کہ اپنے دشمنوں کے نام کی تحقیر کرنے کے لئے اس کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ شاید یہودیوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنی قوم کے دشمن میں عدل یا نصرت کی صفت لگی ہوئی پائیں۔ اسی تحقیر کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ و یحییٰ اور مریم کے ناموں میں بھی تحریف کی ہے۔ اس مختصر مضمون میں میں اس سارے مضمون کا اعادہ تو نہیں کر سکتا کہ کیوں یہ نام یوشع، یوحنا اور

ماریہ میں تبدیل کر دیے گئے۔ (شائقین میرا اصل مضمون "اسلامک ریویو" میں پڑھیں) مگر آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ قرآن کے دیے ہوئے نام واقعی اصل نام ہیں اور ان کی تائید قدیم نوشتوں سے ہوتی ہے، جن کی خبر کسی اُمّی کو نہ ہو گی اور نہ ہو سکتی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والے دو نام ہیں، جن کی آج تک جب کہ مصر کے آثار عتیقہ کا انکشاف نہ ہوا تھا، کسی کو خبر نہ تھی اور جس نے اوروں کا تو کیا ذکر، خود مجھ کو بہت عرصہ تک اضطراب میں ڈال رکھا تھا اور وہ نام ہامان اور عزیر ہیں۔ عام طور سے یہ قیاس کیا گیا کہ عزیر شاید عزرا ہے، جو یہودیوں کا ایک ولی گذرا ہے جس نے تورات کو دوبارہ لکھا تھا اور ہامان کے متعلق تو آج کل کے عیسائی اکثر طنز سے کہا کرتے ہیں کہ یہ وہی ہامان ہے، جو قصہ اشتر میں مذکور ہے اور وہ کسی عجمی بادشاہ کا وزیر تھا۔ آج دونوں کی اصلیت دریافت ہوگئی۔ ہامان اور عزیر مصر کے دو دیوتا تھے، جو امن (Amon) اور عزرس (Osiris) کے نام سے موسوم ہیں اوّل الذکر مصر کا قہرمان دیوتا تھا اور آخر الذکر ٹھیک ویسا ہی دیوتا تھا جیسا اب عیسائیوں میں حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ اب طرفہ اس کا انکشاف باقی ہے کہ مصریوں کی طرح یہودیوں نے بھی اس کو ابن اللہ کا خطاب دیا تھا۔ کیا یہ بعید ہے کہ بنی اسرائیل نے جہاں غیر قوموں کے اعتقاد اور رسوم اپنے میں داخل کئے (مثلاً قربانی، سبت وغیرہ) ان کے مصریوں کی چار سو سالہ صحبت نے یہ نہ سکھلا دیا ہو عربوں نے تو دو سو سال میں شام کے قدیم دیوتا خضر ہی کو خضر بنا لیا تھا حضرت ہود کے متعلق تو شاید معترض یہ کہے کہ یہ عرب کی روایتوں پر مبنی تھا اور اگر ہود کا وجود حسن عرب کے کتبوں سے ثابت ہو گیا، تو کون سی بڑی بات ہے، مگر قرآن کے سوائے کس نے فرعون کو بتایا تھا کہ تیری لاش ایک دن منظرِ عام پر آئے گی اور لوگوں کے لیے باعثِ عبرت ہوگی۔ آج جا کر مصر کے میوزیم میں اس کی تصدیق کر لو۔

"خدا اور رسول کا احترام"

"پھر ان حالات میں جب کہ میں خدا اور رسول کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا وہ (یعنی سید سلیمان ندوی) اُن کو یا کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسلمان نہ سمجھے اور میں کیوں ترکِ اسلام کا اعلان کردوں، جب کہ میں عقائد اسلامی کو اپنے نزدیک اُن سے بہتر سمجھتا ہوں" (نیاز فتحپوری — "نگار" دسمبر ۱۹۴۰ء)

ایک طرف قرآن حکیم کے ارشادات ہیں اور دوسری طرف نیاز فتحپوری کے اقوال، ذیل میں دونوں کو پہلو بہ پہلو نقل کر دیا گیا ہے۔ انہیں پڑھیے اور خدا و رسول کے اس انوکھے احترام کو سمجھنے کی کوشش کیجئے جو نیاز ہی کے الفاظ میں اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

توحید[1]

ارشادات قرآن	اقوالِ نیاز
اُس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی معبود	ایک واعظ صاحب کے توحید کا ذکر

[1] توحید اور اس کے بعد یوم آخرت سے متعلق صرف چند آیتیں پیش کی جا رہی ہیں اور وہ بھی تامل کے ساتھ، جس کتاب کی بنیاد ہی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر رکھی گئی ہو، اس میں سے وحدانیت کے متعلق حوالے اخذ کرنا کچھ عجیب سا ہی معلوم ہوتا ہے! (س)

نہیں ۱۹۳/۳

اُن کے رسولوں نے کہا: کیا (تمہیں) آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے اللہ (کے ہونے) میں شک ہے؟ ۱۰/۱۴

صبح (کی پو) کا پھاڑنے والا اور اس نے رات کو (باعثِ) آرام اور سورج اور چاند کو گھومنے والا بنایا اور یہ اندازہ ہے غالب جاننے والے کا اور اللہ وہ ہے، جس نے ستاروں کو پیدا کیا، تاکہ تم خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں اُن سے راہ پاؤ۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں تفصیل سے (اپنی قدرت کی) نشانیاں بیان کر دیں۔ (۹۷، ۹۸/۶)

کرتا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک گہ دینے سے انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے، مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا، کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے؟

("نگار" اپریل ۱۹۳۶ء)

اس وقت تک دنیا میں مجھے صرف دو باتوں کا علم حاصل ہوا ہے، ایک کا تعلق خدا سے ہے اور دوسری کا اپنی سے، وہ یہ کہ خدا کا انکار اُس کی انتہائی عظمت ہے ("نگار" اگست ۱۹۳۷ء)۔

خدا کے خیال کو، اب وہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے، مگر وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ ("نگار" نومبر ۱۹۳۷ء)۔

یومِ آخرت

اور قیامت کے دن ہم ٹھیک ترازو رکھیں گے پھر کسی شخص پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور جو رائی کے دانے کے برابر

اس کا قائل تو میں کبھی نہیں ہوا کہ قیامت کے دن مُردے قبروں سے اُٹھیں گے اور جوق در جوق محشر میں

کسی کا عمل ہوگا، تو ہم اس کو بھی تولنے کے لیے حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ۲۱/۴۷

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ ۳۶/۷۵

البتہ تم درجہ بہ درجہ رتبۂ اعلیٰ پر چڑھو گے ۲۰/۸۴ [لہ]

جس روز ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کے سامنے بہ طور مہمان جمع کریں گے اور گنہگاروں کو دوزخ کی طرف پیاسے ہانک لے جائیں گے ۸۶/۲۰

لوگو! اگر تم کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے میں کچھ شک ہو، تو ہم نے تم کو پہلی بار بھی تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے، پھر اُس سے نطفہ بنا کر، پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر، پھر اُس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی، تاکہ تم پر

جمع ہوں گے اور باقاعدہ حساب کتاب ہو کر دوزخ و جنت کی سزا انھیں ملے گی، لیکن یہ ضرور یقین کرتا تھا کہ مرنے کے بعد روح قائم و باقی رہتی ہے اور روحانی مسرّت و اذیّت کا دوسرا نام فردوس و جہنّم رکھا گیا، لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بھی محو ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج میں روح کی بقاء کا بھی قائل نہیں اور پورے اعتقاد و یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ زندگی نام ہے امتزاجِ عناصر کے اعتدال کا اور جب یہ اعتدال باقی نہیں رہ جاتا، تو انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے اور موت نام ہے بالکل نسیًا منسیًا ہو جانے کا۔[لہ] (مجموعہ استفسار و جواب صفحہ ۲۶)

حضرت! میں پرستش و پرستش کا تو قائل نہیں ہوں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ بُرے اعمال یہیں انسان کے حشر کو خراب کر دیتے ہیں اور یہیں اُن کی سزا

[لہ] موت کے ساتھ انسان نسیًا منسیًا نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس کی ہستی قائم رہے گی اور نہ صرف قائم رہے گی، بلکہ بہ تدریج ترقی بھی حاصل کرے گی۔

اپنی خالقیت ظاہر کردیں اور ہم جس کو
چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک
پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو
بچہ بناکر نکالتے ہیں، پھر تم جوانی کو
پہنچتے ہو اور بعض (قبل از پیری)
مرجاتے ہیں اور بعض نہایت خراب
عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت
کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم
ہوجاتے ہیں اور (اے دیکھنے
والے!) تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک
پڑی ہوتی ہے، پھر جب ہم اس پر
مینہ برساتے ہیں، تو وہ شاداب
ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے
اور طرح طرح کی بارونق چیزیں
اُگاتی ہے۔ ان قدرتوں سے ظاہر
ہے کہ خدا ہی (قادر مطلق ہے، جو)
برحق ہے اور یہ کہ وہ مُردوں کو زندہ
کردیتا ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قدرت

مل جاتی ہے، مرنے کے بعد سوال وجواب،
نکیرین کی تشریف آوری، فشارِ قبر وغیرہ
یہ سب اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ
اسی ڈر سے اچھے کاموں کی طرف متوجہ
ہوں"۔

"آپ مہربانی فرماکر خدا سے تو بحث
کیجیے نہیں کہ اُس کو نہ ہماری عبادت سے
فائدہ ہے نہ بغاوت سے نقصان۔ نہ اُس کو
دوزخ میں ڈالنا ہے نہ جنت مہیا کرنا"
("نگار" دسمبر ۲۵ء)۔

خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے
کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور بُرے
کاموں کی تشنیع کے لیے کوئی اہتمام کرے۔
ہمارا عذاب و ثواب، ہماری دوزخ و
جنت خود ہمارے اندر اور ہمارے ساتھ
ہے، جو بالکل اسی طرح لازمی طور پر ظہور
پذیر ہو جاتی ہے، جس طرح دوا اور دارو کا
نتیجہ چار۔۔۔ [1] خدا نے جو سلسلہ

---

[1] یہ "سلسلہ اسباب وعلل اور نتائج کا پیدا کرنے والا" خدا، وہی خدا تو نہیں، جس کا آپ انکار کرچکے ہیں؟ (سلیمانی)

رکھتا ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی
ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں اور یہ کہ
خدا سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں
جلا اُٹھائے گا۔
۷-۵/۲۲

اسباب وعلل اور نتائج کا پیدا کر دیا ہے،
اس کے مطابق تمام مظاہر رونما ہوتے
ہیں اور ہوتے رہیں گے، جس میں خدا کی
معافی یا سرزنش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا۔ ("نگار" اگست ۲۹ء)

اسلام

دین تو خدا کے نزدیک اسلام
ہے اور اہل کتاب نے جو (اس دین
سے) اختلاف کیا، تو علم حاصل ہونے
کے بعد آپس کی ضد سے کیا اور جو
شخص خدا کی آیتوں کو نہ مانے، تو خدا
جلد حساب لینے والا ہے۔ ۱۹/۳
اور ابراہیمؑ کے دین سے وہی
نفرت کرے گا، جو احمق ہو گا (۱۳۰/۲)
۔۔۔ اے پیغمبر کہہ دے (نہیں)
بلکہ ہم ابراہیمؑ کے دین کے پیرو ہیں،
جو سیدھی راہ پر تھا۔ ۱۳۵/۲
اور جو شخص اسلام کے سوا کسی
اور دین کا طالب ہو گا، وہ اس سے

اسلام یک سر عمل تھا، لیکن نہایت
عاجلانہ، یک سر جنبش و حرکت تھا، لیکن
مضطربانہ، پھر اُس وقت کے حالات
کے لحاظ سے تو یہ ٹھیک تھا، لیکن اب
اوّل تو یہ ممکن نہیں، اگر ہو بھی، تو یہ مفید
نہیں ہو سکتا۔ ("نگار" فروری ۳۹ء)
ابراہیمؑ اور داؤد کا مذہب اُس وقت
کے لیے موزون رہا ہو گا، لیکن اب وہ
بے کار ہے۔ موسیٰ و مسیح کی تعلیمات
اس زمانے کے لیے مناسب رہی ہوں گی،
لیکن اب لوگ ان میں سینکڑوں تاریخی
وعلمی نقائص نکال رہے ہیں! ("نگار"
اکتوبر ۳۰ء)۔

ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا (۳/۸۵)

آج ہم نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔ (۵/۳)

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے، جو بلایا تو جائے اسلام کی طرف اور وہ خدا پر جھوٹ بہتان باندھے اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (۶۱/۷)

ان پیغمبروں کو ہم نے کتاب اور شریعت اور پیغمبری عطا فرمائی۔ (۵۷/۲۶)

اور اُسی (خدا) نے لوگوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید سے پہلے تورات اور انجیل نازل کی (۳/۴)

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کو اپنے دل سے بنالے (۱۰/۳۷)

خدا کو مطلقاً اس کی ضرورت نہیں

کہ دنیا میں کوئی مذہب ہو! ("نگار" اکتوبر ۱۹۳۰ء)

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے، جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے، تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہنچا دے، ورنہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہ جانا بھی یقینی ہے۔ ("نگار" اگست ۱۹۳۴ء)۔

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کیے تھے اور خداوند الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں، وہ بھی انسانوں ہی کے دماغ کا نتیجہ ہیں۔

("نگار" اپریل ۱۹۳۷ء)

قرآن مجید کی روایات

(قرآن مجید جن واقعات کا ذکر کرتا ہے ان کے آثار و نشانات تو اب بھی زمین پر دیکھے جا سکتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:)
اور تم دن کو بھی (پچھلی قوموں کی) تباہ و برباد بستیوں (کے کھنڈرات) کے پاس سے گذرتے ہو اور رات کو بھی تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (۳۷/۱۳۸)
ان آبادیوں کا تھوڑا حال ہم تم کو سناتے ہیں۔ (۷/۱۰۱)

قرآن مجید میں روایات عہد عتیق کا ذکر صرف "بصورت نقل و حکایت" پایا جاتا ہے اور کسی جگہ واقعہ تاریخی کی حیثیت ان کو نہیں دی گئی اس لیے ان روایات کو واقعیت یا تاریخی صحت کے ثبوت میں کلام مجید کو پیش کرنا درست نہیں۔
("نگار" نومبر ۱۹۳۶ء)

صوم و صلوٰۃ

نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکو (۲/۴۳)
اور رنج و راحت میں صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک نماز گراں ہے مگر اُن لوگوں پر گراں نہیں، جو عجز کرنے والے ہیں۔ (۲/۴۵)

میں حیران ہوں کہ جنبش اعضاء کی چند مقررہ صورتیں (یعنی نماز) اور فقر و فاقہ کی تنگی (یعنی روزہ) کو کیوں سعادت انسانی سمجھا جائے۔ ("نگار" اپریل ۱۹۳۶ء)
اس ماہ کا رسالہ چار چھ دن کی تعویق سے شائع ہو رہا ہے، جس کا ایک ضعیف سبب تو فروری کے مہینے کا اختصار تھا

تمام نمازیں اور نماز وسطیٰ پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو اور خدا کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے رہا کرو! (۲۳۸/۲)

مسلمانو! جس طرح اگلے لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی طرح تم کو بھی گنتی کے چند دن روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو! (۱۸۳/۲)

جو کوئی تم میں رمضان کا مہینہ پائے تو چاہیے کہ وہ اس میں روزہ رکھے (۱۸۵/۲)

اور دوسرا قوی سبب یہ کہ "نگار" کے جدید کاتب جو ضرورت سے زیادہ متقی واقع ہوئے ہیں، ماہ رمضان کی وجہ سے کافی وقت نہ دے سکے اور اس طرح اس ماہ کے "نگار" کو اپنی پابندی بطور خراج اُن کے زہد و ورع کے حضور پیش کرنی پڑی اور چونکہ میں پابندِ صیام نہیں ہوں، اس لیے میں نے بھی یہ کفارہ دینا آسانی سے گوارا کر لیا۔

("نگار" مارچ ۱۹۲۹ء)

خدا تعالیٰ کی رزّاقیّت

اور (سب کو) وہ کھانا کھلاتا ہے اور خود کھانے کا محتاج نہیں ہے بے شک اللہ ہی روزی دینے والا ہے

وہ زمانہ گذر گیا جب بندگی میں انسان کا بھلا ہوتا تھا اور خدا پر مخلوق کا رزق پہنچانا فرض تھا

لہ انسان "متقی" ہو، تو کم از کم "نگار" کے کاتب جیسا تو ہو، الحاد اور دہریت کی کھلی تبلیغ کی اعانت اور اس پر مدیر "نگار" کی طرف سے تقوے کا سرٹیفکیٹ، بڑا خوش قسمت انسان ہے، جسے یہ سعادت حاصل ہو جائے۔

بڑی مضبوط قوت والا۔ ۵۸/۸۱ | ("نگار" نومبر ۳۸ء)

اجابتِ دُعا

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے، تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں (۱۸۱/۲۰)

نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے۔ ("نگار" اپریل ۳۱ء)

شراب

مسلمانو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب اور جؤا اور بت اور استخارے کے پانسے، ناپاک شیطانی کام ہیں تو تم ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے میں (تمہیں پھنسا کر) تمہارے درمیان عداوت اور نفرت ڈالے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک لے! ۹۰/۵

شراب واقعی اثردہا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں، خاص کر ہماری آپ کی عمر میں کہ اس وقت تو بیدا ہیں تو اسکے شیخ بوعلی سینا آب حیات سے کم تر نہیں، کسی بلائے آسمانی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، پی کر دیکھیے عذاب و ثواب میری گردن پر! ("نگار" فروری ۳۷ء)

یہ ہے اس شخص کے عقائد و اعمال کا اجمالی خاکہ، جو نہ خدا کا قائل ہے نہ قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرتا ہے، نہ حشر و نشر کو مانتا ہے، نہ قرآن حکیم کے قصص کی صحت کا اقرار کرتا ہے، نہ اسلام کو عہدِ حاضر کے لیے مفید سمجھتا ہے،

نہ روزے کا پابند ہے اور نہ نماز کا حامی، اور کھلی تلقین کرتا ہے شراب خوری اور بے حیائی کی ـــــ اور ان سب چیزوں کے باوجود دعوے یہ کرتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور عقائد اسلامی کو تمام علمائے اسلام سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں ـــــ دنیا میں غالباً یہ پہلی مثال ہے کہ ایک شخص اسلام کا کھلم کھلا انکار کرکے بھی، مسلمان کہلانے پر مُصر ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی بے بسی کی بھی غالباً یہ پہلی ہی مثال ہوگی کہ وہ اس فتنہ پرور انسان کو، جو تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں سالہا سال سے اپنے ناپاک خیالات کا زہر پھیلا رہا ہے، راہ راست پر نہیں لا سکے!

محمد اقبال سلمانی

لما آرٹ پریس امرتسر میں باہتمام رام ناتھ پرنٹر چھپی اور پبلشر عبدالحفیظ نے اُمت مسلمہ (ہند) امرت سر سے شائع کی +

ہماری بہترین کتابیں

برہان القرآن | اہلحدیث جماعت، حدیثوں کو بھی قرآن مجید کی طرح وحی مانتی ہے اور اسے "وحی خفی" کا نام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ آں حضرت صلعم کو خدا ہی کی طرح اصل مطاع بھی مانتی ہے۔ یہ دونوں عقیدے اسلام کی اصلی سپرٹ کے خلاف ہیں۔ اس موضوع پر حضرت خواجہ احمد الدین صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب کے درمیان ۱۹۲۲ء میں ایک تحریری مباحثہ ہوا تھا، جس میں مولوی ثناء اللہ صاحب کو شکست فاش ہوئی تھی۔ "برہان القرآن" اس مباحثے کی مکمل رُوداد ہے۔ قیمت [struck] ۔

ریحان القرآن | اُمتِ مسلمہ یوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو وحی تسلیم نہیں کرتی، اس لیے بعض اہلحدیث مولویوں نے اس کے مسلک کے مختلف رسالے لکھ کر اعتراض کیے ہیں۔ ریحان القرآن میں مولوی حبیب الرحمن مئوی کے رسالہ "نصرت الحدیث" مولوی قاسمی کے "عقاید کفریہ" اور مولوی عبداللہ کے "عقاید بے حدیثیہ" وغیرہ کے مکمل جوابات دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید ہی تمام ضروریات وحی کے لیے کافی و کامل ہے۔ قیمت ۶ر

تفسیر سورۂ فاتحہ | اس چھوٹی سی کتاب میں سورۂ فاتحہ کے حسن و جمال کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اس میں بعض ایسے مطالب آگئے ہیں، جو آپ کو بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی نہیں مل سکتے۔ جو اصحاب اسلام کی بنیادی صداقتوں کو سمجھنا چاہیں، وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ قیمت ۳ر

ملتِ ابراہیمؑ | اس میں بتایا گیا ہے کہ دین در اصل ابراہیمؑ ہی کا دین ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم اسی دین کے مبلغ تھے اور اسی دین کی پیروی اور اتباع سے ہماری نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن بنی نوع انسان کو اسی دین کی دعوت دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی مکمل سیرت یہاں تک کہ ان کی پرائیویٹ زندگی بھی قرآن ہی میں موجود ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک تتمہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ہماری تمام دینی ضروریات کی تفصیل قرآن پاک میں موجود ہے اور ہمیں غیر از قرآن کسی دوسری کتاب کی بطور وحی کے ضرورت نہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں قرآن مجید کی بیان کردہ صفات ابراہیمؑ کی تشریح و تفسیر کا مبسوط اضافہ کیا گیا ہے، جو سیرت خلیلؑ سے متعلق نہایت اہم نکات اور معلومات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۵ر

جنت کا گہنا | ایک نہایت سادہ سلیس اور عام فہم نظم ہے جو بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ نظم کسی خاص فرقے سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہر شریف گھرانے کا فرض ہے کہ وہ اس نصیحت آموز ٹریکٹ کو منگوا کر اپنی بچیوں کو پڑھائے اور حکمت و دانائی کی باتوں سے ان کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ قیمت ایک آنہ

علم حدیث | (از علامہ اسلم جیراج پوری) اس رسالہ میں علم حدیث پر نہایت دل نشین انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۲ر

جنگ اور اسلام | مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک بیش
قیمت کتاب جس میں آپ نے جنگ کے متعلق اسلام کی
پوزیشن اور اس کے فلسفے پر نہایت عمیق نگاہ ڈالی ہے یہ
ایسا موضوع ہے جس پر تمام بڑے بڑے غیر مسلم مصنفوں نے
رائے زنی کرتے ہوئے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے
ضروری ہے کہ یہ کتاب کم سے کم ایک مرتبہ ہر مسلمان کی نظر سے
گذر جائے تاکہ اُسے معلوم ہو کہ درحقیقت جنگ کے متعلق
اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

قول احسن | مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا سب
سے بڑا باعث ان کی فرقہ بندی ہے۔ قول احسن میں قرآن مجید
کے مضامین سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اصولی طور
پر فرقہ بندی کا مخالف ہے ہمیں صرف مسلم کہلانا چاہیے
باقی تمام نام شیعہ سنی اور اہل حدیث وغیرہ بدعی ہیں
جن کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو نقصان عظیم پہنچ رہا ہے
قیمت چار آنہ

پیام امن | مغرب کے مشہور سائنس دانوں مفکروں
اور ادیبوں کے اعترافات قرآن حکیم کی درخشانی کے متعلق
کہ یہ کتاب واقعی نوع انسان کی بہترین راہنما ہے آپ
بھی اس دلچسپ مفید اور موثر کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ ۸؍

مطالعہ حدیث | ڈپٹی سید مقبول احمد بی اے کی
تصنیف ہے جس میں آپ نے تنقید صحیح کی روشنی میں
احادیث کی حقیقت واضح کی ہے۔ ابتدا میں مولانا اسلم
جیراجپوری کا مقدمہ ہے جو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے
مصنف نے ان میں احادیث پر نظر ڈالتے ہوئے اسرائیلیات
زندیقیت، دجالی، معراج، قتل مرتد، غلامی، اوقات
نماز، ایام صیام اور زکوٰۃ کے تمام حدیثوں پر نہایت
اچھا تبصرہ کیا ہے۔
یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ مسلمانوں نے قرآن مجید
کو ترک کرکے اور اس کے بجائے حدیثوں کی غلامی اختیار
کرکے کیا کیا نقصان اٹھائے ہیں۔ قیمت عہ؍

حضرت محمد رسول اللہ | اس میں واضح کیا گیا
ہے کہ آں حضرت صلعم نے انسداد غلامی کے لیے کیا
تعلیم فرمائی۔ قیمت سلہ؍

تحقیق قربانی | آغاز کتاب میں علامہ اسلم جیراجپوری
کا عالمانہ دیباچہ ہے۔ اصل کتاب میں قربانی کی قدیم تاریخ
اور قرآن مجید سے رسم قربانی کے اصلاحی بیانات پوری
تحقیق سے قلم بند کیے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے
کہ قربانی کا اصل مقام صرف خانۂ کعبہ ہے۔ عہ؍

اقبال کی پیش گوئیاں | اس رسالہ میں علامہ
اقبالؒ کے کلام سے وہ اشعار انتخاب کر لیے گئے ہیں
جن کا تعلق موجودہ حالات اور آیندہ زمانے سے
ہے۔ قیمت ۴؍

تعلیمات قرآن | (از علامہ اسلم جیراجپوری)
اس کتاب کے پڑھنے سے کامل طور پر واضح ہو جاتا
ہے کہ قرآن مجید اپنی تشریح کے لیے بالکل کافی ہے
اور کسی انسانی تفسیر کا حقیقتاً محتاج نہیں۔ قیمت
دو روپے چار آنے۔

صفات القرآن | اس کتاب کا مقصد یہ ہے
کہ مسلمان قرآن حکیم کی قدر و منزلت سے روشناس
ہوں اور اس کے احکام پر عمل کریں قیمت ۴؍

چند منتخب کتابیں

علامہ اقبالؒ

بانگ درا	للعہ
ضرب کلیم	سے
بال جبریل	للعہ
زبور عجم	للعہ
اسرار و رموز	سے

مولانا ابوالکلام آزاد

مقالات آزاد	سے
مضامین آزاد	سے
خطبات آزاد	ہے
جنگ اور اسلام	۱۲

چودھری افضل حق

میرا افسانہ	عہ
جواہرات	عہ
خطوط افضل حق	۱۲

زندگی	سے
دین اسلام	عہ
محبوب خدا	عہ

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی	للعہ
شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	عہ
شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	عہ ۱۲

محمد علی جناح

ارشادات جناح	عہ ۱۲
خطبات جناح	عہ

منشی پریم چند

حب وطن	عہ
میدان عمل	للعہ
واردات	عہ

متفرق کتابیں

مضامین عبدالماجد	للعہ
پیاری زمین	عہ
اقبال کا مطالعہ	عہ
امام ابن تیمیہ	عہ
خطوط سرسیدؒ	سے ۱۲
خطبات مدراس	عہ
حضرت مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید	عہ ۱۲
تاریخ القرآن	عہ ۱۲
مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل	عہ
شاہ اسمعیل شہیدؒ	عہ
جمال الدین افغانیؒ	۶
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	سے
فیصلہ کن جنگیں	عہ
کمپنی کی حکومت	للعہ

مکتبہ امت مسلمہ (ہند) امرتسر

امت مسلمہ (ہند) امرتسر کا ماہوار رسالہ

البیان

اسلام وہ نہیں ہے، جسے ہمارے فرقہ پرست مولوی پیش کرتے ہیں۔ نہ وہ ہے جو غیر قرآنی دقیانوسی کتابوں میں بند ہے، بلکہ اسلام وہ ہے، جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا، یعنی ہر زمانے کا مذہب، زمین و آسمان کا مذہب، فطرت اور سائنس کا مذہب! ...... "البیان" گذشتہ بیس سال سے اسی اسلام کو پیش کر رہا ہے اگر آپ قرآن مجید کی صداقتوں کو سائنس اور معقولیت کی روشنی میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں تو "البیان" کا مطالعہ کیجیے۔ قیمت سالانہ تین روپے۔

منیجر رسالہ "البیان" امرتسر

اُمّتِ مُسلمہ امرتسر کی دینی خدمات

۱۔ ایک ماہوار رسالہ جاری کیا گیا، جو بیس سال سے قرآن حکیم کی خدمتِ اشاعت میں مصروف ہے۔
۲۔ تبلیغی کاموں کے لیے ہزارہا روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان مسجد، ایک مستقل دفتر اور متعدد عمارات تعمیر کرکے خدا کی راہ میں وقف کی گئیں۔
۳۔ اسلامی تہواروں کے علاوہ وقتاً فوقتاً ہزارہا تبلیغی پوسٹر شائع کیے گئے۔
۴۔ "بیانٌ للنّاس" کے نام سے قرآن مجید کی ایک بہترین تفسیر شائع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بیسیوں دینی کتابیں شائع کی گئیں۔
۵۔ مسلمانوں کی قومی و ملّی اصلاح کے لیے ۵۰۰ کتابیں مُفت تقسیم کی گئیں۔
۶۔ کئی سالانہ جلسے منعقد کیے گئے، جن کے ذریعے ہندوستان کے چیدہ چیدہ علماء نے مسلمانوں کو اپنے خیالات سے مستفید کیا۔
۷۔ ایک لائبریری قائم کی گئی جس سے بے شمار مسلمان علمی اور دینی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔
۸۔ مدرسہ "تبلیغ القرآن" کے نام سے ایک قرآنی سکول جاری کیا گیا جس میں ترجمہ قرآن اور صرف و نحو عربی کی بلا فیس تعلیم کا انتظام ہے۔
۹۔ بین الاقوامی درسِ قرآن کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ جہاں ہر روز صبح ایک گھنٹے تک تفسیر و مذاکرہ رہتا ہے۔ دُور و نزدیک سے طلبائے قرآن اور بعض دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر مسئلے پر ایسی فراخ دلی، تہذیب اور آزادی سے گفتگو ہوتی ہے جس کی مثال عام مجالسِ درس میں نہیں ملتی۔
۱۰۔ متعدد روشن خیال مبلّغ مقرر کیے گئے جن کے ذریعے سے ملک کے دُور دراز گوشوں میں قرآن مجید کی آواز پہنچ رہی ہے۔

اگر یہ خدمات کسی بھی لحاظ سے آپ کے دل میں خدمت و اشاعتِ قرآن کا اشتیاق پیدا کر سکیں تو ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ براہِ کرم ہر ممکن تکلیف و ایثار گوارا کر کے دفتر اُمّتِ مُسلمہ کی مالی و اخلاقی سرپرستی قبول فرمائیں۔ امداد کی صورتیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) آپ کم از کم دو آنہ (۲؍) ماہوار چندہ دے کر مجلس کے رُکن بن جائیں (۲) تین روپے سالانہ چندہ بھیج کر ماہنامہ **البیان** اپنے نام جاری کرائیں۔ ایک، دو، تین جتنے بھی ہو سکیں، جدید خریدار مہیا کر کے ان کا چندہ بھجوا دیں (۳) دفتر اُمّت کی مطبوعات خریدیں (۴) تبلیغی فنڈ میں اپنا اور اپنے دوستوں کا حصہ ارسال فرمائیں۔

ناظم اُمّتِ مُسلمہ (ہند) امرتسر

ہمارے دینی علوم

حضرت علامہ محمد اسلم جیراج پوری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس کتاب میں علامہ موصوف کے پانچ مقالے شامل ہیں جن میں علم تفسیر، علم حدیث اور علم فقہ کی علمی و دینی حیثیت پر قرآن مجید کی روشنی میں محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اس کتاب کے مطالعے سے آپکو دو بڑے فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ آپ تفسیر، حدیث اور فقہ کے معنی و مفہوم اور حقیقت و اصلیت سے باخبر ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ بھی جان سکیں گے کہ ان علوم کا قرآن مجید سے کیا تعلق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دینیات میں آپ نے جس قدر مطالعہ کیا ہے، اس پائے کی کتاب آپ نے نہیں دیکھی ہوگی۔ کتاب کا انداز بیان بے حد دلکش، زبان بہت ہی سلیس اور نفس مضمون نہایت قابل قدر ہے۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت مجلد عہ

علم وراثت

مسلمانوں کے موجودہ علم وراثت میں از روئے قرآن مجید چند شدید غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مروجہ قانون فقہ کی رُو سے یتیم پوتے کو ورثے میں کچھ نہیں ملتا۔ ضرورت تھی کہ اس قسم کی غلطیوں کی قرآن مجید کی روشنی میں تردید کی جائے۔ حضرت خواجہ احمد الدین مرحوم نے اس موضوع پر دو نہایت اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ الوراثت فی القرآن جس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور برگ سبز جس کی قیمت ۳ر ہے۔ ہر اُس مسلمان کے لیے جو قرآن مجید کے رُو سے علم وراثت کو جاننا اور سمجھنا چاہیئے۔ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

کامیاب زندگی

یورپ کے شہرہ آفاق مصنف ہربرٹ این کیسن کی کتاب (CLIMBING UP) کا اُردو ترجمہ۔ اس کتاب میں گیارہ باب ہیں، جن میں مصنف نے اپنے عمر بھر کے قیمتی تجربے جمع کر دیے ہیں اور زندگی کے اُن بہترین اصولوں کی تشریح کی ہے، جن پر عمل کرکے ہر شخص اپنی زندگی کو خوش گوار اور کامیاب بنا سکتا ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں (۱) ذمہ داری (۲) دوستی (۳) سامان کا مطالعہ (۴) کام میں تفریح (۵) فرض منصبی (۶) کچھ مزید کام (۷) صحت (۸) کمپنی کی شراکت (۹) نفع مندی۔

ہر نوجوان کو اس مفید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت مجلد عہ

مکتبہ اُمتِ مُسلمہ (ہند) امرت سر

دو قرآن

دو قرآن میں جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک نہیں دو ہیں۔ ایک وہ جو کتاب کی شکل میں ہر گھر میں موجود ہے۔ دوسرا وہ جو کائناتِ ارض و سما کی شکل میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ سورج، چاند، بادل ہوائیں، پھول، پھل، سونے چاندی، کوئلے اور لوہے کی کانیں، کوہ و صحرا اور بحر و بر اس وسیع و بسیط قرآن کی آیات ہیں۔ ایک قرآن میں لکھی ہوئی آیتیں ہیں، دوسرے میں عمل و حرکت کرتی ہوئی آیتیں۔ ایک قرآن اصول و قوانین کا ضابطہ ہے اور دوسرا اُس کی عملی تشریح۔

جناب ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق ایم اے، پی ایچ، ڈی نے یہ کتاب لکھ کر درحقیقت قرآن پاک کی اتنی خدمت سرانجام دی ہے جس کی سعادت اس سے پہلے ہندوستان کے کسی مسلمان کو حاصل نہیں ہوئی۔ مظاہرِ فطرت کے متعلق کوئی آیت ایسی نہیں، جسے اُنھوں نے قرآن کی روشنی میں پیش نہ کیا ہو۔ ہم اُن تمام مسلمانوں کی خدمت میں جو قرآن کے سرچشمے سے سائنس کے پیالے میں پانی لے کر اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں، اس کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۵۲۰ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ محصول ڈاک الگ۔

مکتبہ اُمّتِ مسلمہ (ہند) امرت سر